سرسبز جنگل کے اُس پار قرمزی پہاڑیوں کی اوٹ سے سورج کی نارنجی کرنوں نے سر اُبھارنا شروع کردیا تھا۔ آکاش کا نیلگوں رنگ دھیرے دھیرے زرد، نارنجی اور ارغوانی رنگوں میں گھلتا جارہا تھا۔ بادِ نسیم کے نرم جھونکوں میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

بستی کی اکلوتی مسجد کے بلند مینار سے موذن کی مترنم آواز اُبھری تھی۔ وہ رب جلیل کی کبریائی اور عظمت کا اعلان کررہا تھا اور نیند میں مستغرق لوگوں کو نماز کی طرف بلا رہا تھا...... "بے شک نماز، نیند سے بہتر ہے۔"



سُلطان محمد تغلق

اشتیاق فاطمہ علی

پہلی قسط

"یاذوالجلال والاکرام" رب جلیل کی جلالت وعظمت کا اقرار کرتا، نوجوان غیاث الدین بستر سے اُٹھ بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ والے بستر پر اس کا باپ ملک قتلغ خان ابھی گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔

ملک قتلغ خان کا تعلق ترک قبیلے قراؤنہ سے تھا۔ وہ ترک وطن کرکے ترکستان اور سندھ کے اس درمیانی علاقے میں آ آباد ہوا تھا۔ اس نے پنجاب کے ایک ہندو جاٹ کی لڑکی سنگیتا کو مسلمان کرکے شادی کی تھی اور اب اس کا نام رحمت خداوندا تھا۔

غیاث الدین نے نگاہ گھما کر گول چوبی ستونوں سے گھرے دالان کی جانب دیکھا، جہاں اس کی ماں رحمتِ خداوندا، اس کے چھوٹے بھائی رجب اور بہن فردوس جہاں کے ساتھ زمین پر بچھے اونٹ کے اون سے بنے خاکستری غالیچے پر سوئی ہوئی تھی۔

اس نے جھک کر نرم انداز میں باپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔

"بابا جان، اذان ہوگئی ہے، اب آپ کو نماز کے لئے بیدار ہوجانا چاہئے۔" اس کی مودب، مہذب اور میٹھی آواز کان میں پڑتے ہی ملک قتلغ خان کلمہ طیبہ پڑھتا اُٹھ بیٹھا تھا۔

"رجب کو بھی جگالو، اب وہ نو برس کا ہوگیا ہے۔ اس پر نماز فرض ہوگئی ہے۔" ملک قتلغ خان نے اپنے جواں سال بیٹے کو ہدایت کی اور خود جوٹ کی جوتیوں میں پیر پھنساتا وضو کے لئے چل دیا۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں باپ، بیٹے نماز فجر کی ادائیگی کے لئے مسجد کی طرف رواں دواں تھے۔

نماز کے بعد ملک قتلغ خان چھوٹے بیٹے رجب کے ساتھ گھر کے لئے روانہ ہوگیا تھا۔ ناشتے کے بعد اسے سندھی سوداگر کے اصطبل جانا تھا۔ پچھلے کئی سالوں سے وہ یہ کام کررہا تھا۔ صبح سے رات گئے تک سخت محنت ومشقت کے بعد بس اتنی آمدنی ہوتی تھی کہ نہایت تنگی ترشی سے دو وقت کی دال روٹی چلتی تھی۔

غیاث الدین مسجد سے نکل کر جنگل کی طرف چل دیا تھا۔ یہ سرسبز و شاداب گھنا جنگل اُسے بیحد پسند تھا۔ نیلے آسمان کو چھوتے گھنے تناور درخت اور ان کے سڈول تنوں سے لپٹی پھولوں سے لدی نازک بیلیں، خاور نو کے مدھم اُجالے میں بڑی بھلی معلوم دیتی تھیں۔ ہواؤں کے نرم اور شریر جھونکوں پر جھومتے پیڑ اور ان سے لپٹی نازک بیلوں کا کومل رقص، لچکتی شاخوں پر چہچہاتے خوش رنگ وخوش گلو طیور...... آنکھوں کو تراوٹ بخشتا دور تک پھیلا سبزہ، فضاؤں میں خوشبو لٹاتے انواع واقسام کے رنگ برنگے دلکش ورعنا پھول اور مشام جاں کو تازگی عطا کرتی ہواؤں میں بسی سبزے اور نوبہ نو پھولوں کی مہک......

شیشم، پیپل، نیم اور املتاس کے تناور درختوں کے تنوں سے تیزی سے اُترتی چڑھتی کالی آنکھوں اور معصوم چہروں والی گلہریاں...... سبزے اور خودرو پودوں کی اوٹ سے سر نکال کر اپنی ارغوانی حیران آنکھوں سے تکتے روئی کے گالوں کے سے سفید خرگوش اور ہلکی سی بھی آہٹ پر اُچھل کر قلانچیں بھرتے غزال...... یہ سب کچھ غیاث الدین کو بہت اچھا لگتا تھا۔

ہر تخلیق اپنے خالق کی عظمت اور حکمت کی منہ بولتی تصویر تھی۔ ذرہ ذرہ خالق حقیقی کی صناعی کا بے مثل ثبوت تھا۔ وہ دیدہ ودل کو حیرت، تقویت اور راحت دیتے نظاروں کا دیدار کرتا، باری تعالیٰ کی حمد وثناء کرتا، اِدھر اُدھر گھوم پھر کر گھر میں جلانے کے لئے خشک لکڑیاں جمع کرتا...... اشراق کے وقت تک واپس گھر لوٹ آتا۔ لکڑیاں ماں کے حوالے کرکے مدرسے کی جانب روانہ ہوجاتا تھا۔

وہ ناظرہ وحفظ قرآن مجید کے بعد آج کل حدیث، فقہ اور تصوف کے علوم کی تحصیل میں مشغول تھا۔

خاص طور پر تصوف آج کل اس کی توجہ کا مرکز تھا۔ وہ گھنٹوں اپنے استاد مولوی رکن الدین ولی حسین کے ساتھ تصوف کے موضوع پر بحث وتمحیص میں مصروف رہتا۔

"اسلام میں تصوف کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو پہچان کر اس سے والہانہ محبت اور اس کی جستجو کی جائے۔" مولوی رکن الدین ولی حسین اپنی سفید داڑھی کو مٹھی میں بھینچتے ہوئے پُرسوچ انداز میں فلسفۂ تصوف پر روشنی ڈالتے۔ "عقل کی پیچیدگیوں میں بھٹکنے کی بجائے جستجوئے حق کے لئے اپنی زندگی وقف کردی جائے کہ اس جہان فانی کی بجائے اللہ کی محبت منتہائے مقصود بن جائے۔ دل کی پاکیزگی سے اصلی راہ ہدایت میسر ہو اور قلب کو ایسی روشنی حاصل ہو کہ بجز جمال ربی کے کچھ دکھائی نہ دے...... دائرۂ اسلام میں رہ کر اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق عمل کرنا چاہئے...... صوفی کو اس راہِ سلوک میں بے شمار مشکل منزلیں طے کرنی پڑتی ہیں۔ اس کے بعد ہی اللہ کا نور حاصل کیا جاسکتا ہے۔"

"اور راہِ تصوف اور طریقت پر چلنے والے صوفی کا مقام اور مرتبہ کیا ہوتا ہے؟"

غیاث الدین کے سوال پر مولوی صاحب رشک بھرے لہجے میں گویا ہوتے۔ "راہِ طریقت کے ان مسافروں کا مقام ومرتبہ...... اللہ اللہ...... بظاہر فقیر نظر آنے والے یہ صوفی، اکثر شہنشاہوں سے بالاتر ہوتے ہیں، یہ عشق حقیقی میں ڈوب کر کائنات کی ہر شے کو بھول کر مالک کائنات کو پا لیتے ہیں...... وہ اپنے لئے تو کچھ مانگتے ہی نہیں، کسی اور کے لئے وہ جو طلب کرتے ہیں تو اللہ ان کی طلب کو رد نہیں کرتا۔ وہ شانِ جلال میں جس کو جو بخش دیتے ہیں، وہ رب ذوالجلال بھی عطا کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا۔"

"یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" غیاث نے اُلجھے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "کیا کوئی انسان محض عبادت وریاضت کے طفیل عطا کے منصب پر فائز ہوسکتا ہے؟"

اور یہ سوال تاحیات غیاث الدین کے دل وذہن کو مضطرب کرتا رہا۔ وہ بزرگان دین، صوفی، ولی اللہ اور فقراء کو بھی اس بلند منصب پر تسلیم نہ کرسکا۔

غیاث مدرسے سے نکل کر گھر کی سمت چل دیا۔

اس کا چھوٹا بھائی رجب اور چھوٹی بہن فردوس جہاں دالان میں بچھے خاکستری غالیچے پر بیٹھے کھیل میں مشغول تھے جبکہ اس کی ماں باورچی خانے میں ناشتے کی تیاری میں مصروف تھی۔ اس کے ساتھ اس کے والد کے رشتے کے بھائی احمد جنید کی بیٹی مخدومہ جہاں بھی موجود تھی۔

احمد جنید دس سال قبل اپنی چہیتی بیوی اور اکلوتی بیٹی کے ساتھ، اسی محلے میں آکر آباد ہوا تھا اور قلعی گری کا کاروبار شروع کیا تھا۔ خدا نے اس کے کاروبار میں وسعت وبرکت عطا کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے عمدہ، پختہ گھر اور بازار میں بڑی دکان خرید لی تھی...... وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ ایک خوش وخرم اور آسودہ زندگی بسر کررہا تھا کہ جانے کس کی نظر اس کی خوشحال زندگی کی شادمانی کو نگل گئی...... ابھی مخدومہ صرف پانچ سال کی تھی کہ اس کی ماں محض چند روز بخار میں مبتلا ہوکر اس دارفانی سے کوچ کرگئی۔ احمد جنید کی ہنستی بستی دنیا اُجڑ گئی تھی۔

اُن دکھ کے دنوں میں ملک قتلغ خان اور اس کی بیوی رحمت خداوندا نے احمد جنید اور اس کی کمسن بچی کا بے حد خیال رکھا تھا اور لحہ لحہ اس کے غم میں شریک رہے تھے۔ رحمت خداوندا نے ننھی مخدومہ کو ایک محبت کرنے والی ماں کی طرح اپنے ممتا کے دامن میں چھپالیا تھا۔

بیوی کی موت کے بعد احمد جنید نے اپنی زندگی، اپنی لاڈلی بیٹی مخدومہ جہاں کی پرورش وتربیت کے لئے وقف کردی تھی اور لوگوں کے اصرار اور مشوروں کے باوجود دوسری شادی کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ننھی سی بیٹی کی انگلی تھامے تنہا ہم سفر کرتے اسے اب دس برس بیت چکے تھے۔

اب مخدومہ پندرہ برس کی ہوچکی تھی اور آج کل وہ اس کی شادی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مخدومہ ایک حسین، رعنا، نیک، صالح، سلیقہ شعار اور خدمت گزار لڑکی تھی۔ اس کا زیادہ وقت رحمت خداوندا کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ وہ اسے مثل ماں کے سمجھتی تھی اور جب وقت ملتا، وہ اس کی خدمت اور مدد کے لئے جا پہنچتی تھی۔ اس وقت بھی وہ ناشتہ بنانے میں اس کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔

آہٹ پر اس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ کشادہ شانوں اور مضبوط ڈیل ڈول والے اونچے لمبے، گورے چٹے غیاث الدین کو دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں حیا اُتر آئی تھی۔ اس نے اپنی عنابی دبیز اوڑھنی صندلی پیشانی تک کھینچ لی تھی۔

"امی جان! بابا جان کہاں ہیں؟" غیاث الدین نے کشادہ صحن پر اُچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

"وہ اصطبل پر گئے ہیں۔" ماں نے جواب دیا۔ "تم اندر جاکر بیٹھو، مخدومہ تمہارے لئے ناشتہ لارہی ہے۔"

وہ مزید کچھ کہے بنا اندر دالان میں غالیچے پر جا بیٹھا تھا اور چند لمحوں بعد کج کج قدم دھرتی مخدومہ ناشتے کی چوبی سینی اٹھائے دالان میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے گلابی پیروں میں پڑی ریشمیں پازیبوں کی نقرئی کھنک نے خاموش فضا کو گدگدا کر جگا دیا تھا۔ غیاث الدین نے بے ساختہ نگاہیں اٹھا کر مخدومہ کی سمت دیکھا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی اس کے سامنے ناشتہ لگا رہی تھی۔ ناشتے میں شہتوت اور گڑ سے بنی روٹی تھی، مٹی کے پیالے میں قہوہ اور ایک چوبی پیالے میں کدو کا شوربہ بھی تھا۔

"شکریہ......" غیاث الدین نے مشکور لہجے میں کہا۔

"شکریے کی کیا بات ہے؟" مخدومہ کی مترنم آواز گونجی۔ "آپ کوئی غیر تو نہیں ہیں، آپ کا اور آپ کے گھر کا کام...... میرے لئے میرے گھر جیسا ہی ہے۔"

غیاث الدین نے حیران نظروں سے مخدومہ کی طرف دیکھا۔ اس کی ریشمیں پلکیں، مخملیں رخساروں پر جھکی ہوئی تھیں۔ مخدومہ کے لہجے کے اپنے پن نے اس کے نوجوان دل میں ایک عجب سا احساس بیدار کیا تھا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکا تھا۔

☆......☆......☆

سورج کی روپہلی کرنوں سے دمکتے کائنات کے نقرئی رخساروں پر دھیرے دھیرے شام کی سرمئی زلفیں بکھرتی جارہی تھیں۔ دھوپ کی تمازت سے پگھلتی ہواؤں میں ایک بے نام سی تسکین آمیز ٹھنڈک گھلتی محسوس ہورہی تھی۔

غیاث الدین سارا دن اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال اور دھلائی، رگڑائی میں مصروف رہا تھا۔ کچھ گھوڑوں کی نعلیں کسنا تھیں، کچھ کے ایال تراشنے تھے۔ تمام وقت وہ انہی کاموں میں جتا رہا تھا۔ اب شام ڈھلے جاکر کہیں فراغت نصیب ہوئی تھی اور وہ تھکے وجود اور سنسناتے ذہن کے ساتھ گھر جانے کی بجائے جنگل کی طرف نکل آیا تھا۔ وہ شام کے ڈھلتے سایوں میں کچھ دیر چہل قدمی کرکے، رُوح پر چھائی تھکن کو کم کرنا چاہتا تھا۔

سبز درختوں کی اونچی شاخوں کو سورج کی زرد کرنیں الوداعی بوسہ دیتی رخصت ہورہی تھیں۔ وہ یہ خوبصورت منظر اپنی آنکھوں میں بھرتا آہستگی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اُسے اپنے پیچھے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ اس نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ سامنے ایک اونچا، لمبا سپاہی الغ خانی لشکر کی وردی میں چلا آرہا تھا۔ اس کے کشادہ شانوں پر پیتل کے بکل ڈھلتے سورج کی نارنجی کرنوں میں چمک رہے تھے اور بکلوں سے بندھی سنہری کلابتوئی ڈوریاں ہوا کے نرم جھونکوں کے ساتھ ہلتی بھلی معلوم ہورہی تھیں۔ اس کی خاکستری وردی میں کمر پر سرخ منقش کے کام کا پٹکا کسا ہوا تھا۔ اسی کے ساتھ پیتل کے منقش دستے والا دودھاری خنجر لٹک رہا تھا۔ کاہی رنگ کے اس کے عمامے میں سفید پَر ٹنکے تھے اور پہلو سے لٹکتی میان اس کے وقار میں اضافہ کررہی تھی۔

اس شاندار وردی میں وہ بے حد باوقار اور پُرشکوہ لگ رہا تھا۔ وہ سپاہیانہ انداز میں سینہ تانے اور اپنے بھاری بوٹوں سے دھرتی کا سینہ ٹھونکتا اس کے قریب چلا آیا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی غیاث الدین نے پُرجوش آواز میں اسے سلام کیا اور پھر اپنائیت بھرے انداز میں مصافحہ کیا۔ وہ اس کی وردی اور پُررعب شخصیت سے بہت متاثر ہوا تھا۔

"میرا نام شادی خان ہے۔" سپاہی نے اس کا ہاتھ اپنے چوڑے اور مضبوط ہاتھ میں جکڑتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ "میں سلطان علاء الدین خلجی کے بھائی الغ خان کی فوج کا سپاہی ہوں...... راہ بھٹک کر اس جنگل میں نکل آیا ہوں، کیا منزل تک پہنچنے میں آپ میری رہنمائی کریں گے؟"

"کیوں نہیں؟" غیاث الدین نے جلدی سے جواب دیا۔ "آپ جانے کتنا سفر کرکے یہاں تک پہنچے ہیں...... تھکن آپ کے چہرے سے ہویدا ہے، غالباً آپ نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں ہے...... قریب ہی میرا گھر ہے، کیا ہی اچھا ہو اگر آپ کچھ دیر کے لئے میرے گھر تشریف لے چلیں۔ میری والدہ گڑ، شہتوت اور جو سے میٹھی لذیذ روٹی تیار کرتی ہیں، جو یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔ کچھ دیر آرام کے بعد آپ اپنی منزل کی جانب روانہ ہوجایئے گا۔"

"شکریہ میرے دوست۔" شادی خان نے ممنون لہجے میں جواب دیا اور دوستانہ انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ دھرتا ہوا، محبت بھرے لہجے میں بولا۔ "آپ کی اس محبت بھری دعوت کا شکریہ مگر اس وقت میں جلدی میں ہوں، آپ کی یہ دعوت اُدھار رہی، اس وقت تو آپ یہ احسان کریں کہ مجھے روپ گڑھ کا راستہ بتادیں۔"

"جی ضرور!" غیاث الدین اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ اس کی وردی کو مسلسل تحسین اور رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں میری وردی کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی ہے۔" چند لمحوں بعد شادی خان نے مسکراتے ہوئے شوخ لہجے میں کہا تو غیاث الدین جھینپ کر مسکرادیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "یہ شاندار لباس آپ پر خوب جچ رہا ہے...... یہ وردی بہت اچھی ہے۔"

"اگر تمہیں یہ وردی اتنی ہی اچھی لگ رہی ہے تو تم یہ وردی کیوں نہیں پہنتے؟"

"میں اسے کس طرح پہن سکتا ہوں؟" غیاث الدین نے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

"تم ایک مضبوط، توانا اور شاندار نوجوان ہو۔" شادی خان نے اس کی طرف پُرستائش نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "الغ خان کو اپنے لشکر میں شامل کرنے کے لئے ایسے نوجوانوں کی ہمیشہ ہی تلاش رہتی ہے...... تم جب بھی یہ وردی پہننا چاہو، میرے پاس روپ گڑھ چلے آنا...... انشاء اللہ تمہیں الغ خان کے لشکر میں ضرور ملازمت مل جائے گی، میں تمہاری بھرپور مدد کروں گا۔"

"اگر ایسا ہوسکے تو بہت اچھا ہوگا۔" غیاث الدین کا چہرہ جوش مسرت سے تمتمانے لگا۔ "اس مدد کے وعدے کا شکریہ......" اس نے تشکر بھرے لہجے میں کہہ کر سپاہی کا ہاتھ تھام لیا۔ "مگر تم اپنا یہ وعدہ بھول مت جانا۔"

"ہرگز نہیں۔" شادی خان نے سینے پر ہاتھ مار کر مضبوط لہجے میں کہا۔ "تم جب چاہو میرے پاس چلے آنا، یہ تم سے میرا وعدہ ہے۔ میں تمہیں الغ خان کی فوج میں ضرور بھرتی کروادوں گا۔"

غیاث الدین نے قریبی جھیل سے اس کی چھاگل پانی سے بھردی اور کچھ جنگلی پھل توڑ کر اس کے تھیلے میں ڈال دیئے اور وہ اسے روپ گڑھ کے راستے تک پہنچانے گیا۔ پھر اس نے بغل گیر ہوکر اسے رخصت کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد وہ گھر کی طرف چل دیا۔ شام کے سرمئی سائے رات کی گاڑھی تاریکی میں مدغم ہوگئے تھے۔ سامنے برآمدے کے ستون سے بنے طاقچے پر چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ چراغ کے مدھم اُجالے میں مخدومہ ستون سے ٹیک لگائے افسردہ کھڑی تھی۔ وہ اسے اس وقت یہاں کھڑے دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ مغرب سے پہلے وہ ہمیشہ ہی اپنے گھر چلی جاتی تھی۔

"میں تمہارا انتظار کررہی تھی۔" اس نے دھیمی اور گلوگیر آواز میں کہا۔ "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

غیاث الدین نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ آج اس کے لہجے کی شوخی اور آواز کی کھنک افسردہ سی سنجیدگی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی دراز گھنی پلکیں بھیگی اور روشن غزالی آنکھیں نم تھیں۔

تب ہی اندرونی کوٹھری سے اس کی ماں کی آواز آئی۔

"مخدومہ...... وہاں کیا کررہی ہو؟ اندر چلی آؤ۔"

مخدومہ چونک کر پلٹ گئی۔ "نہیں چاچی، بس...... میں اب گھر جارہی ہوں۔"

ماں کے دالان تک آنے تک مخدومہ داخلی دروازے سے باہر نکل گئی تھی۔

"آج اسے کیا ہوا ہے؟" غیاث الدین نے مخدومہ کو جاتے ہوئے دیکھ کر حیران لہجے میں ماں سے پوچھا تھا۔ "آج یہ بہت غمگین اور دل گرفتہ دکھائی دے رہی تھی؟"

"ہاں جس گھر میں بچپن اور جوانی کا ایک حصہ گزارا ہو، وہ گھر چھوڑ کے جانے کے تصور سے ہی لڑکیاں اسی طرح اداس اور غمزدہ ہوجاتی ہیں۔" ماں نے گہرا سانس لے کر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا مطلب......؟" غیاث الدین حیران ہوا۔ "مخدومہ کہاں جارہی ہے؟"

"اپنے خاوند کے گھر اور کہاں......؟" ماں اس کی ناسمجھی اور بے خبری پر ہلکے سے ہنسی۔ "اس کے لئے ایک اچھے خاندان کے کماؤ لڑکے کا رشتہ آیا ہوا ہے...... اور بھائی احمد جنید جلد ہی اس کی شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"اوہ......!" غیاث الدین کو اپنے سینے میں ایک عجب سی بے چینی اُترتی محسوس ہوئی۔

"خیر چھوڑو...... آؤ تم کھانا کھالو۔" ماں باورچی خانے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"نہیں ماں، اس وقت مجھے بھوک نہیں ہے۔" غیاث الدین نے جواب دیا اور صحن میں پڑی کھاٹ پر جاکر لیٹ گیا۔

ابتدائی تاریخوں کا ہلال جانے کب کا چھپ چکا تھا، البتہ آکاش کے نیلے آنچل میں اَن گنت روپہلے تارے ٹنکے ہوئے تھے۔ تاروں کا مدھم روپہلا اُجالا صحن کی تاریکی مٹانے میں ناکام تھا۔ غیاث ملگجے اندھیرے میں لیٹا مسلسل مخدومہ کے بارے میں سوچے جارہا تھا۔

اسے مخدومہ جہاں سے ایسا کوئی خاص ربط نہ تھا۔ گو کہ وہ عمر میں اس کی بہن فردوس سے کچھ بڑی تھی مگر ان دونوں میں دوستی تھی۔ اس کی ماں مخدومہ کو مثل بیٹی کے پیار کرتی تھی...... اس کا بچپن اسی آنگن میں غیاث کے بھائی اور بہن کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزرا تھا۔ غیاث کیونکہ اپنے گھر میں سب سے بڑا تھا، اس لئے اس کے بھائی بہن کی طرح، وہ بھی اس کی عزت کرتی تھی اور اس کی خاطرداری اور خدمت میں لگی رہتی تھی۔

وہ ایک سلیقہ شعار، خدمت گزار اور خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سمندر کی سی گہرائی تھی اور اس کی کشادہ صندلی پیشانی چودھویں کے چاند کی مانند دمکتی تھی۔ اس کے شہابی رخسار اور نرم تراشیدہ شنگرفی لب بے حد پُرکشش تھے۔ اس کی سیاہ، لمبی زلفوں میں شب دیجور کی سی سیاہی اور نوشگفتہ غنچوں کی سی نرمی اور مہکار تھی۔

وہ بچپن سے ہی غیاث الدین کو پسند کرتی تھی اور جوانی کی حدود میں داخل ہونے تک یہ پسند، محبت کے رنگ میں ڈھل گئی تھی۔ وہ دل کی تمام گہرائیوں اور سچائیوں کے ساتھ غیاث کو چاہتی تھی اور اس کے سوا کسی اور کے ساتھ زندگی بتانے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی اور آج وہ غیاث سے یہ بات کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی تھی۔

لیکن غیاث اس کے کچھ کہے بنا ہی سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس کی بھیگی پلکوں نے اس کے خاموش لبوں کی کہانی کہہ سنائی تھی...... اس نے پہلے کبھی مخدومہ کے بارے میں اس انداز سے نہیں سوچا تھا۔ آج سوچا تو اس سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جانے کے تصور نے اس کے دل میں ایک اذیت ناک احساس بیدار کردیا۔ ایک کسک، ایک تڑپ تھی جس نے اسے مضطرب کردیا تھا۔ کانٹے کی طرح اس کے دل میں چبھتی آرزو کی اس کھٹک نے شب بھر اُسے سونے نہ دیا۔

اور اگلی صبح اس نے ماں کے سامنے اپنی اس بے چہرہ آرزو کا اظہار کردیا تھا۔

"ماں...... میں مخدومہ جہاں سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ماں نے چونک کر اپنے خوبرو، نوجوان بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ ابھی سترہ برس کا نہیں ہوا تھا، ابھی اس کی مسیں بھیگنی شروع ہوئی تھیں۔

خود ماں کے دل میں بھی یہ تمنا ہلکورے لے رہی تھی۔ وہ شروع سے ہی مخدومہ کو اپنے آنگن کا چاند بنانے کی آرزومند تھی مگر مخدومہ کے باپ احمد جنید کی خواہش کے سامنے اس نے اپنی آرزو کا گلا گھونٹ دیا تھا۔

احمد جنید، اپنی اکلوتی اور چہیتی بیٹی کا بیاہ کسی دولت مند گھرانے میں کرنا چاہتا تھا جبکہ ان کے گھر میں مفلسی، مفلوک الحالی اور فاقہ مستی کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا خاوند ملک قتلغ خان جو تھوڑا بہت کما کر لاتا، وہ پانچ نفوس کے پیٹ بھرنے کے لئے ناکافی تھا۔

غیاث الدین کو علم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ وہ ایک ذہین اور محنتی طالب علم تھا مگر گھر کے حالات دیکھتے ہوئے اس نے بھی باپ کے ساتھ اسی اصطبل میں نوکری کرلی تھی مگر یہ نوکری اس قابل نہ تھی کہ اس کے بل پر اس کی ماں دامن پھیلا کر احمد جنید کے گھر اس کی بیٹی کا رشتہ مانگنے جاسکتی۔ سو اس نے اپنے خاوند ملک قتلغ خان سے مشورہ کیا۔

"ہمارا غیاث الدین ہزاروں میں ایک ہے، وہ ایک ذہین طالب علم ہے...... اس کا مستقبل انشاء اللہ بہت روشن ہے...... تم احمد جنید سے بات کرو...... اگر اسے انسانوں کی ذرا بھی پہچان ہوگی تو وہ یہ رشتہ فوراً قبول کرلے گا۔"

خاوند کی طرف سے حوصلہ پاکر رحمت خداوندا، دیور کے گھر دامن پھیلا کر جاپہنچی۔

احمد جنید سوچ میں پڑ گیا تھا۔

غیاث الدین اس کے رشتے کے بھائی کا بیٹا تھا۔ بچپن کا دیکھا بھالا، ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ نیک، صالح، محنتی، حصول علم کا شوقین...... مگر زندہ رہنے کے لئے دو وقت کی روٹی بھی درکار ہوتی ہے جبکہ اس کے بھائی قتلغ خان کے گھر اکثر روٹی کے لالے پڑے رہتے تھے۔ سو اس نے بہت سوچ کر جواب دیا۔

"غیاث الدین مجھے بھی بے حد پسند ہے...... مخدومہ اگر تم جیسی ماں کی طرح چاہنے والی ساس کے گھر بہو بن کر جائے تو اس سے اچھا اور کیا ہوسکتا ہے؟ مگر...... اس کے لئے میری ایک شرط ہے...... کہ اگر چھ مہینوں میں غیاث الدین کوئی ڈھنگ کی نوکری حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے تو مجھے یہ رشتہ سرآنکھوں پر منظور ہے، بصورت دیگر میں چھ ماہ بعد مخدومہ کا عقد کسی اور لڑکے سے کردوں گا۔"

"مجھے یہ شرط منظور ہے۔" ماں کی زبانی چچا کی شرط سن کر غیاث الدین نے پورے وثوق سے جواب دیا تھا اور اگلے ہی دن اس اجنبی سپاہی شادی خان کے پتے کی انگلی تھام کر روپ گڑھ کی طرف روانہ ہوگیا اور ڈھونڈتا، تلاش کرتا بالآخر اس کے پاس پہنچ گیا۔

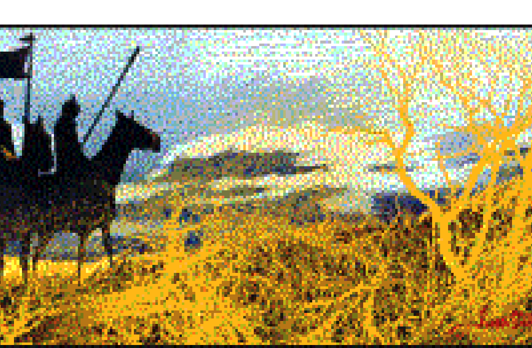
"غیاث الدین تم......؟" وہ اسے دیکھ کر حیرت بھری مسرت سے بولا تھا۔ "خوش آمدید" میرے دوست، تمہارے شوق کو دیکھتے ہوئے مجھے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور آؤ گے۔"

اور اگلے ہی دن شادی خان اسے اپنے رسالدار کے پاس لے گیا تھا اور یوں چند دنوں میں غیاث الدین، الغ خان کی فوج میں بھرتی ہوگیا۔

پانچ ماہ کی فوجی تربیت کے بعد جب وہ فوجی لباس میں ملبوس اپنے گھر پہنچا تو ابھی چھ ماہ پورے ہونے میں پورے چھ دن باقی تھے۔

سنہری بکل اور کلابتو کی دیدہ زیب ڈوریوں سے آراستہ سرخ زردوزی کے کام کے پٹکے اور کلاہ پگڑی میں اس کا اونچا قد اور باوقار سراپا کچھ اور نمایاں ہو رہا تھا۔

مخدومہ جہاں کا باپ احمد جنید اسے دیکھ کر حیران ہونے کے ساتھ خوش بھی ہوا تھا اور اگلے ہی دن اس کا اور مخدومہ کا عقد ہو گیا تھا۔ تقدیر کی اس مہربانی پر وہ دونوں بے حد مسرور تھے۔ مخدومہ کی سیاہ جادو بھری آنکھوں میں بسے خوابوں کو تعبیر مل گئی تھی اور غیاث الدین، مخدومہ جیسی



محبت کرنے والی، خدمت گزار، نیک اور دین دار شریک حیات پاکر خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔

شادی کے مہینے بھر بعد غیاث الدین بیوی کو والدین اور بھائی بہن کے ساتھ چھوڑ کر واپس اپنی نوکری پر چلا گیا تھا۔ اسے مخدومہ سے ہی نہیں اپنے ماں باپ اور بھائی بہن سے بھی بے حد محبت تھی اور وہ ان کے لئے راحتیں، خوشیاں اور آسودہ زندگی خریدنا چاہتا تھا۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے آگے بڑھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔ اب کے موسم سرما اس کے خاندان کے لئے ایک سانحہ لے کر آیا تھا۔ سردی لگ جانے کے باعث اس کے باپ ملک تغلق خان کو بخار ہو گیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے بخار نے بگڑ کر سرسام کی شکل اختیار کرلی تھی۔

غیاث الدین تک باپ کی بیماری کی خبر پہنچی تو وہ چھٹی لے کر گھر چلا آیا۔ باپ کے علاج معالجے اور دیکھ بھال میں اس نے کوئی فروگزاشت نہ چھوڑی، پر ملک تغلق کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ ہر طرح کی دوا دارو، دیکھ بھال اور دعا کے باوجود وہ شفا نہ پا سکا اور دسمبر کی ایک سرد رات میں اس نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کردی۔

باپ کی موت غیاث الدین کے لئے ایک بڑی صدمہ ہی نہیں، اس کی ذمہ داریوں میں اضافہ بھی تھا۔ اپنی ماں اور بھائی بہن کا اب وہی سرپرست اور کفیل تھا اور وہ نہایت خلوص اور احسن طریقے سے ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کا ارادہ رکھتا تھا کیونکہ وہ ایک چاہنے والا خاوند ہی نہیں، ایک فرمانبردار اور صالح بیٹا اور ایک بے حد شفقت و محبت کرنے والا بھائی بھی تھا۔

☆.....☆.....☆

آفتاب کا نارنجی گولا نیلے آسمان کے سینے پر دہک رہا تھا۔ ہواؤں کے جھونکوں میں دھوپ کی تمازت رچی ہوئی تھی، پر الغ خان کی اونچے برجوں والی سنگی حویلی کے سامنے دور تک پھیلے چٹیل میدان میں، صفوں میں کھڑے اس کی فوج کے سپاہی سورج کی تپش، گرم ہوا کے تھپیڑوں اور دھوپ کی تمازت سے بے نیاز سینہ تانے کھڑے تھے۔ ان کے کاندھوں پر لگے پیتل کے بکل دھوپ میں چمک رہے تھے، ان کے توانا قدم مضبوطی سے زمین پر جمے ہوئے تھے اور عقاب کی طرح تیز نگاہیں سامنے کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

آج الغ خان کا بڑا بھائی سلطان دہلی، علاء الدین خلجی فوج کے سالانہ معائنے کے لئے آنے والا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد علاء الدین خلجی اپنے ساتھیوں الغ خان، امرت خان، الپ خان اور ظفر خان کے ساتھ فوج کے معائنے کے لئے آ پہنچا۔

علاء الدین خلجی سب سے آگے تھا۔ غرور و تکبر سے تنے اس کے سر پر مخصوص قسم کا تاج دھرا تھا۔ تاج کی پیشانی پر رنگین پروں کا فردا ہوا سے ہل رہا تھا اور تاج کے بیچوں بیچ لگا یاقوت سورج کی تیز کرنوں میں دمک رہا تھا۔ اس کے حریری فرغل پر زردوزی کا نفیس کام تھا۔ اس کی کمر میں بندھے پٹکے پر یاقوت و زمرد جڑے تھے۔ اس کی تنی ہوئی گردن میں سچے موتیوں اور بیش بہا پتھروں کی مالائیں تھیں جبکہ انگلیوں میں جواہرات کی انگوٹھیاں موجود تھیں۔

سلطان علاء الدین خلجی شاہانہ انداز میں قدم بڑھاتا فوجوں کی صفوں سے گزرتا آگے بڑھ رہا تھا۔ تب ہی آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم وہ رک گیا تھا۔ اس کی عقاب جیسی تیز نگاہیں، سر صف کھڑے نوجوان، خوبرو اور حسین و باوقار سپاہی پر جمی ہوئی تھیں۔ سپاہی کے کشادہ شانے، تنا ہوا سینہ اور اونچی روشن پیشانی اسے دوسرے تمام سپاہیوں سے ممتاز کر رہی تھی۔

''تمہارا نام.....؟'' سلطان نے ٹھہرے ہوئے باوقار لہجے میں سوال کیا۔

''سلطان معظم..... اس نمک خوار کو غیاث الدین بن ملک تغلق کہتے ہیں۔''

غیاث الدین کے پُر اعتماد لہجے میں دیئے گئے جواب کو سن کر سلطان دہلی کے باریک لبوں پر غیر محسوس سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔

''غیاث الدین تغلق.....'' اس نے اس کے نام کے ساتھ اس کے باپ کے نام کو شامل کرکے زیر لب دہرایا۔ اس کی جوہر شناس نگاہوں نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس معمولی سپاہی پر اگر خصوصی توجہ دی جائے تو وہ ایک غیر معمولی سپہ سالار ثابت ہو سکتا ہے۔ اسی لئے جب وہ دہلی کے لئے روانہ ہوا تو غیاث الدین تغلق بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس نے اس جوہر نا تراش کو الغ خان سے مانگ لیا تھا۔ وہ اس پتھر کو تراش کر بیش بہا ہیرا بنانے کا متمنی تھا۔

دہلی پہنچ کر سلطان نے اسے امیر آخور (سرکاری گھوڑوں کا نگران اعلیٰ) مقرر کیا۔ کچھ ہی عرصے میں اس کے نام کا لاحقہ تغلق، تغلقو ہوا، پھر بگڑ کر ''تغلق'' ہو گیا۔ اب وہ ''غیاث الدین تغلق'' کہلاتا تھا۔

وہ فطرتاً بہت بہادر اور دلیر تھا۔ علم کا شوق اب بھی اس کے دل میں موجزن تھا۔ اسے جب موقع ملتا، وہ علماء و مشائخ کی محفلوں میں شریک ہو کر اپنی علم کی پیاس بجھانے کا سامان کرتا رہتا تھا۔

علاء الدین اس کی بہادری، شجاعت اور لیاقت سے بے حد متاثر تھا..... چنانچہ اسے منگول حملہ آوروں کے خلاف دیپال پور اور سمانہ جیسے اہم سرحدی صوبے کا گورنر مقرر کردیا۔

ایک معمولی سپاہی سے امیر آخور اور پھر گورنر جیسے اعلیٰ ترین عہدے تک پہنچنے میں نو سال کا طویل عرصہ بیت گیا تھا۔ اب غیاث الدین تغلق ایک چھوٹے سے نیم پختہ گھر کی بجائے ایک شاندار حویلی میں رہائش پذیر تھا۔ اس کی مشفق ماں رحمت خداوندا، اس کا چہیتا بھائی رجب، پیاری بہن فردوس جہاں اور عزیز از جان بیوی مخدومہ جہاں بھی اس کے ساتھ اس پُرشکوہ حویلی میں رہائش پذیر تھی۔

ان نو سالوں نے اسے بہت کچھ دیا تھا مگر اب تک اس کا دامن اولاد کی نعمت سے خالی تھا۔ مخدومہ جہاں ایک بے حد اچھی، بے پناہ محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی تھی، اس نے ہر طرح کی خوشیوں سے اس کا دامن بھر دیا تھا، پر وہ اسے اب تک اولاد کی خوشی نہ دے سکی تھی۔ اب اس کی ماں کو بہو کی خالی گود کھلنے لگی تھی۔ وہ دبی دبی زبان میں بیٹے کو دوسری شادی کا مشورہ دینے لگی تھی۔

مخدومہ کو اپنے غم سے زیادہ ساس اور خاوند کی خوشی مقدم تھی، اسی لئے ایک شب اس نے غیاث الدین سے کہا۔ ''آپ دوسری شادی کرلیجئے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں آنسوؤں کی نمی اُتر آئی تھی۔

''کیوں.....؟'' اس نے انجان بن کر سوال کیا۔ ''تم جیسی اچھی بیوی کے ہوتے مجھے دوسری شادی کی کیا ضرورت ہے۔''

''یہ کوئی معیوب بات تو نہیں ہے۔'' مخدومہ نے بھیگی پلکیں اٹھائیں۔ ''یہاں اکثر لوگ تین تین، چار چار شادیاں کرتے ہیں، اگر آپ دوسری شادی کرلیں گے تو..... کیا غلط بات ہوگی؟''

''مخدومہ..... میرے شہر دل میں داخل ہونے والی تم پہلی عورت ہو اور میں چاہتا ہوں کہ تم میری زندگی کی آخری عورت ثابت ہو..... میں اپنی زندگی کے آخری لمحے تک صرف اور صرف تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''میں بہت خوش نصیب ہوں کہ مجھے آپ جیسا چاہنے والا خاوند ملا۔'' مخدومہ جہاں نے فرط محبت سے اس کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ''اماں جان کی خواہش ہے کہ آپ صاحب اولاد ہوں۔ شاید یہ خوشی میں آپ کو نہیں دے سکتی..... اس لئے آپ.....''

''اولاد کی خواہش کسے نہیں ہوتی؟'' غیاث الدین نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا تمہیں یہ خواہش نہیں ہے؟ مجھے بھی یہ خواہش ہے..... مگر میری یہ خواہش تمہارے دم سے پوری ہوگی..... اگر میری قسمت میں اولاد ہے تو مجھے یہ دولت تمہارے وجود سے حاصل ہوگی..... اگر ایسا نہیں ہے تو میں اولاد کی خواہش سے دستبردار ہونے کے لئے تیار ہوں..... مگر دوسری شادی کے بارے میں سوچنے کے لئے تیار نہیں.....''

خاوند کے اس بے پناہ پیار پر مخدومہ کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں اور اس نے دامن دل پھیلا کر اللہ سے دعا کی تھی۔

''خداوند..... مجھے، ایک، صرف ایک بیٹا عطا کردے۔''

''اور ہم اس کا نام ''جونا خان'' رکھیں گے۔'' غیاث الدین نے مسکرا کر کہا اور وہ نم آنکھوں کے ساتھ بے ساختہ ہنس پڑی تو غیاث کو جیسے بارش میں اچانک دھوپ نکلنے کا منظر یاد آگیا۔

☆.....☆.....☆

غیاث الدین تغلق کو سلطان علاء الدین خلجی نے دہلی میں طلب کیا تھا۔ وہ اپنے اس نوجوان گورنر سے سرحدی علاقوں میں منگولوں کے پے در پے حملوں کے سلسلے میں گفت و شنید کرنا چاہتا تھا۔

''اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو میں بھی آپ کے ساتھ دہلی چلوں؟'' مخدومہ جہاں نے دھیمی آواز اور آس بھرے لہجے میں گزارش کی تھی۔

''بھلا مجھے کیونکر ناگوار ہوگا۔'' غیاث الدین نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر تم اس طویل مسافت کی صعوبتیں جھیل کر وہاں کیوں جانا چاہتی ہو؟''

''میں صوفی بزرگ نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضر ہو کر اولاد کے لئے دعا کرنا چاہتی ہوں۔ سنا ہے نگاہ مرد مومن سے تقدیریں بھی بدل جایا کرتی ہیں۔''

''عطا کرنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔'' غیاث الدین نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ''مانگنا ہے تو صرف اسی سے مانگو..... البتہ اگر تم ان بزرگ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتی ہو تو مجھے کچھ اعتراض نہیں ہے۔''

دہلی پہنچنے کے بعد دربار سلطانی میں حاضری دینے سے قبل وہ بیوی کی خوشی کی خاطر پہلے نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضر ہوا۔

اس وقت نظام الدین اولیاؒ جذب کی کیفیت میں تھے۔ غیاث الدین پر نظر پڑتے ہی وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور عالم بے خودی میں اس سے مخاطب ہوئے۔ ''تو ٹھیک کہتا ہے، عطا کرنے والی صرف اللہ کی ذات ہے۔'' پھر وہ مخدومہ جہاں کی طرف متوجہ ہوئے اور اسے پانچ بیٹوں کی نوید سنائی۔ اس کے بعد غیاث الدین کی طرف مڑے اور فرمایا۔ ''جا تیرے جونا خان کو ہم نے منتخب کرلیا۔''

غیاث الدین نے ان باتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جبکہ مخدومہ جہاں بے حد خوش اور پُر امید تھی۔

بیوی کو رہائش گاہ پر چھوڑ کر وہ دربار سلطانی کی طرف چل دیا۔ وہ لباس فاخرہ میں ملبوس سلطان دہلی علاء الدین خلجی کے پُر شکوہ دربار کی طرف رواں دواں تھا۔ وہ سلطان دہلی کے جاہ و جلال سے واقف تھا، بڑے بڑے امراء جلال شاہی کا سامنا کرتے ہوئے گنگ ہو کر رہ جاتے تھے۔

غیاث الدین بلبن کے بعد کیقباد تخت نشین ہوا۔ وہ بلبن کے بڑے بیٹے بغرا خان کا لڑکا تھا۔ اگرچہ اس کو اچھی تعلیم اور بہترین تربیت دی گئی تھی لیکن حکومت کے نشے میں وہ سب کچھ بھول گیا اور عیش و نشاط کی بانسری بجانے لگا اور امور سلطنت اپنے وزیر نظام الدین کے ہاتھوں میں سونپ دیئے۔

نظام الدین نے من مانی شروع کردی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ امراء کیقباد کی مخالفت پر کمربستہ ہو گئے۔ کیقباد کے والد بغرا خان نے بیٹے کو سمجھانا چاہا لیکن وہ باپ کی نصیحت پر توجہ نہ دے سکا اور وزیر نظام الدین کو زہر دلوا دیا اور اس طرح ایک دانا وزیر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔

کثرت شراب نوشی اور عیش پرستی کے باعث کیقباد کی صحت چند برسوں میں ہی جواب دے گئی اور وہ محض انیس برس کی عمر میں ستر سال کا نحیف و نزار بوڑھا لگنے لگا تھا لہٰذا ترک امراء نے اس کے تین سالہ بیٹے کیمورث کو تخت پر بٹھا دیا اور خلجی خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سازش شروع کردی۔

خلجی سردار جلال الدین کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے فوجی طاقت کے بل پر کیمورث اور کیقباد دونوں کا خاتمہ کردیا اور خلجی امیر جلال الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

اس طرح ''خاندان غلاماں'' ختم ہوا اور ''خاندان خلج'' کی حکومت کا دور شروع ہوا۔

خلجی، ترک نسل سے تھے اور ترکی سردار ابن یافث کے ایک لڑکے خلج کی اولاد سے تھے۔ ایک اور نظریہ کے مطابق خلجی منگول سردار چنگیز خان کے داماد قلیج خان کی اولاد تھے، اسی کی نسبت سے یہ لوگ پہلے خلج اور بعد میں خلجی کہلانے لگے۔

انہی خلجیوں میں سے ایک سردار ملک فیروز خاندان غلاماں کا خاتمہ کرکے جلال الدین فیروز شاہ کے لقب سے تخت دہلی پر متمکن ہوا۔

جلال الدین خلجی نے اپنے بھتیجے علاء الدین خلجی کو اپنے بیٹوں کی طرح پالا تھا اور بعد میں اپنی بیٹی کا نکاح بھی علاء الدین سے کردیا تھا۔ اسے کڑہ (الہ آباد) اور اودھ کی جاگیریں بھی عطا کی تھیں اور اسے ''عارض ممالک'' کا منصب بھی عطا کیا تھا۔

مالوہ کی مہم کے دوران علاء الدین دیوگری فتح کرنے کا منصوبہ بنانے لگا اور اس مہم پر سلطان کی اجازت کے بغیر روانہ ہو گیا۔ دیوگری پہنچ کر علاء الدین خلجی نے یہ خبر عام کروا دی کہ سلطان خود بیس ہزار فوج لے کر آیا چاہتا ہے۔

یہ خبر سن کر دیوگری کے ہندو راجا اور پرجا میں خوف و ہراس کی لہر دوڑ گئی۔ راجہ نے قلعہ بند ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ علاء الدین خلجی نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ چند دنوں کے محاصرے کے بعد راجا نے صلح کی پیشکش کی جو قبول ہوئی۔ راجہ نے بیشمار تحائف و نذرانے دینے کا وعدہ کیا۔ اتنے میں راجہ کا بیٹا راج کمار سنگھ جو شکار کے لئے گیا ہوا تھا، آ پہنچا اور اس نے صلح کی شرائط ماننے سے انکار کردیا۔ اس پر گھمسان کا رن پڑا۔ کچھ عجب نہیں تھا کہ علاء الدین ہار جاتا لیکن اس کی فوج کا ایک دستہ جو قلعے کے دروازے پر تعینات تھا، آن پہنچا۔ راجہ کے سپاہی یہ سمجھے کہ سلطان جلال الدین خلجی آ پہنچا ہے۔ پس پھر کیا تھا، علاء الدین خلجی کی شکست فتح میں بدل گئی، راجہ کی فوج منتشر ہوگئی اور دیوگری پر علاء الدین خلجی کا قبضہ ہو گیا۔

بے شمار دولت اور کثیر تعداد میں تحفے تحائف لے کر وہ واپس کڑہ پہنچا اور اپنے سپاہیوں اور امراء کو انعامات و اکرامات سے نوازا۔

جب سلطان جلال الدین خلجی کو اپنے داماد اور بھتیجے علاء الدین خلجی کی دیوگری کی مہم اور فتح کا پتہ چلا تو وہ بجائے ناراض ہونے کے، کیونکہ علاء الدین نے یہ فیصلہ اس کی اجازت کے بغیر کیا تھا، بے حد خوش ہوا اور وہ اسے مبارک باد دینے کے لئے بذات خود کڑہ کے لئے روانہ ہو گیا۔

اس کے امراء نے اس اقدام سے اسے باز رکھنے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانا اور ایک کشتی میں سوار ہو کر کڑہ کی طرف چل دیا۔ اس کے سوار خشکی کے راستے روانہ ہوئے، لہٰذا کڑہ پہنچتے ہی جوں ہی بوڑھا سلطان، علاء الدین سے بغلگیر ہوا، علاء الدین کا اشارہ پا کر منظم سازش کے تحت چند اشخاص نے سلطان پر حملہ کردیا اور اس کا سر تن سے جدا کردیا۔

یوں علاء الدین خلجی کے حامی امراء نے جلال الدین خلجی کے قتل کے فوراً بعد علاء الدین کے سلطان ہونے کا اعلان کردیا۔

30 اکتوبر 1296ء کو دہلی میں بلبن کے بنوائے ہوئے سرخ محل میں علاء الدین کی رسم تاج پوشی ادا کی گئی اور سابقہ سلطان جلال الدین خلجی کے بیشتر رشتے داروں اور حامیوں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ارکلی خان کے سولہ بیٹے تھے۔ تمام کے تمام قتل کردیئے گئے اور اس طرح خون سے ہاتھ رنگنے کے بعد علاء الدین خلجی نے دہلی میں اپنی حکومت کا آغاز کیا۔

علاء الدین ایک بہترین حکمران ثابت ہوا۔ اس نے آئے دن ہونے والی بغاوتوں کے اسباب کا انسداد کیا۔ جنوبی اور شمالی ہند میں فتوحات کیں، فوجی اصلاحات کیں۔ معاشی و اقتصادی حالات پر نظر کی اور بازار کا کنٹرول مضبوط کیا اور اشیاء کی قیمتیں متعین کیں۔

علاء الدین کے نزدیک رعایا کی معاشی بھلائی کا خیال رکھنا، سلطان کا اہم فریضہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لوگوں کو سستی روٹی ملنی چاہئے لہٰذا اس نے امراء کی جیبیں خالی کرکے غرباء کو ان کا حق دلوایا۔ اس نے تنخواہ پانے والے عمال کی تنخواہوں میں اضافہ کیا اور اشیاء کی قیمتوں میں کمی کی۔

علاء الدین خلجی ایک زبردست منتظم، ایک بہترین سپہ سالار اور قابل فخر فرماں روا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے ارادے کا پکا، بہترین قوت فیصلہ کا حامل انسان تھا۔ وہ اپنی کامیابی اور ترقی کی راہ میں کوئی رکاوٹ برداشت نہیں کرتا تھا، وہ کسی بھی کام کو مشکل سمجھ کر ہار نہیں مانتا تھا۔ وہ ایک نہایت بہادر شخص تھا۔ اس نے اپنی راہ میں آنے والے لاتعداد اشخاص کے خون سے اپنے ہاتھوں کو سرخ کیا۔

مورخ برنی کے مطابق ''علاء الدین خلجی نے جس قدر معصوم لوگوں کا خون بہایا، شاید ہی کسی فرعون مصر نے بہایا ہوگا۔''

جس وقت غیاث الدین تغلق اپنی بیوی مخدومہ جہاں کو رہائش گاہ پر چھوڑ کر دربار میں حاضر ہوا، اس وقت تک شام ہو چکی تھی اور علاء الدین خلجی دربار برخاست کرکے اپنی ادبی و علمی محفل میں جلوہ افروز تھا۔ سلطان علاء الدین خلجی علوم و فنون اور ادب و شاعری کا بے حد قدردان تھا۔ اس کے دربار میں امیر خسرو اور امیر سنجری جیسے مشہور شعراء موجود تھے۔

حضرت امیر خسرو ہر فن میں ماہر تھے۔ وہ شاعر، نثر نگار، سلطان کے مصاحب خاص لطیفہ گو، بذلہ سنج اور حضرت نظام الدین اولیاؒ کے حلقۂ ارادت سے منسلک تھے۔ وہ فارسی اور ہندی کے بے نظیر شاعر تھے۔ وہ صوفیانہ غزلوں، حکایتوں اور پہیلیوں کے لئے مشہور تھے۔ انہیں موسیقی پر بھی خاصی قدرت حاصل تھی۔ موسیقی میں ''خیال'' اور سازوں میں ''ستار'' ان کی ایجاد تصور کئے جاتے ہیں۔

امیر خسرو کو ملا کر 36 علماء اور فضلاء، علاء الدین خلجی کے دربار کی زینت تھے۔

غیاث الدین تغلق کی آمد کی خبر پاکر سلطان علاء الدین خلجی نے سر کی ہلکی سی جنبش سے حاضری کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اگلے ہی لمحے خدام، غیاث الدین کو ہمراہ لئے محفل میں داخل ہوئے تھے۔

اونچے، سڈول سنگی ستونوں سے گھری یہ ایک کشادہ اور گول نشست گاہ تھی۔ بلند و بالا ستونوں پر دیدہ زیب نقوش سے آراستہ چھت ایستادہ تھی۔ چھت کے بیچوں بیچ بلوری فانوس لٹک رہا تھا، جس میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ ستونوں کے ساتھ چھت سے فرش تک خوش رنگ حریری پردے لٹک رہے تھے، جو درمیان سے ستونوں کے ساتھ ریشمی ڈوریوں سے بندھے تھے۔ فرش پر دبیز ایرانی غالیچے بچھے تھے۔ ستونوں کے ساتھ ساتھ گاؤ دم مخملیں نرم تکیے دھرے تھے، جس سے شعراء اور علماء ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ سامنے کی جانب مخملیں نشست پر سلطان جاہ و حشم جلوہ افروز تھا۔ اس کے پیچھے دو نوعمر اور خوبرو خادم مور پنکھ لئے ہوا جھل رہے تھے۔ محفل میں ہر سمت خاموشی اور سکوت کا سا عالم تھا۔ کافوری شمعوں کے مدھم اُجالے میں ایک خوابناک سی کیفیت تھی۔ اس وقت شاعر دانا امیر سنجری فارسی کی ایک غزل پیش کرکے فارغ ہوا تھا اور داد کے بعد اب محفل میں سکوت چھایا ہوا تھا۔

غیاث الدین نے محفل میں داخل ہو کر باآواز بلند سلام پیش کیا تھا اور سلطان کے حضور جھک کر کورنش بجا لایا۔ وہ دربار خلجی کے جلال اور اس کی محفل کے وقار سے کبھی متاثر نہ ہوتا تھا۔ وہ ایک بہادر، دلیر اور نڈر سپاہی تھا۔ علم و ادب سے اسے بھی شغف تھا۔ تصوف و طریقت پر وہ گہری نظر رکھتا تھا مگر وہ کسی بھی بات سے مرعوب و متاثر نہ ہوتا تھا۔ خلجی اپنے اس جیالے سپاہی کی اس خوبی سے خوب واقف تھا اور اس کی دلیری اور بے خوفی کو پسند کرتا تھا، اسی لئے اس نے اسے دیپال پور اور سمانہ کے سرحدی علاقوں کا گورنر مقرر کیا تھا کیونکہ وہاں سے منگول حملہ آوروں کی آمد کا خدشہ رہتا تھا۔

علاء الدین کی تخت نشینی کے فوراً بعد برصغیر پر منگولوں نے خاصے حملے کئے۔ ان حملوں کو روکنے میں علاء الدین کے سپہ سالار خضر خان کی حکمت عملی کا بڑا دخل تھا۔ اس کا مشیر خاص ظفر خان بھی اس سلسلے میں ایک اہم مقام رکھتا تھا۔

''بیٹھو جوان۔'' سلطان نے متبسم لبوں سے خوشگوار لہجے میں غیاث الدین کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔

دربار سلطان میں کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہ تھی، سب نگاہ روبرو، مؤدب و مستعد کھڑے رہتے تھے، صرف سلطان تخت شاہی پر تشریف فرما ہوتا تھا مگر ادبی و موسیقی کی محافل میں لوگوں کو نشست کا شرف حاصل ہوتا تھا۔

غیاث الدین تغلق آداب پیش کرتا مؤدب انداز میں خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''گو کہ یہ محفل شعر و ادب ہے مگر میں اس وقت تم سے، سرحدی حفاظتی تدابیر کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔'' سلطان نے کہا۔

''بندۂ ناچیز ہمہ تن گوش ہے۔'' غیاث الدین تغلق نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے مہذب اور مستعد لہجے میں جواب دیا۔

''گو کہ ہم نے منگولوں کے حملوں کی پسپائی اور شمالی مغربی سرحدوں کے تحفظ کے لئے بہت سے اقدامات کئے ہیں، مثلاً پرانے قلعوں کی مرمت اور نئے قلعوں کی تعمیر، حفاظتی چوکیاں بنوائیں، شاہی افواج کو اس حوالے سے از سر نو منظم کیا..... ہمارے جرنیلوں ظفر خان اور الغ خان نے کئی مرتبہ منگولوں کو شکست دی.....'' سلطان کہتے کہتے لحظہ بھر کو رکا، اس کی عقاب جیسی تیز نگاہیں غیاث الدین کے سنجیدہ اور متین چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ''مگر اب..... ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ تمہیں پنجاب کا صوبیدار بنا کر تمہیں منگولوں سے نمٹنے کا ذمے دار قرار دے دیا جائے۔''

''خاکسار اپنی یہ نئی ذمے داری پوری مستعدی اور دیانتداری سے نبھانے کی کوشش کرے گا۔'' غیاث الدین نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ ''اب آپ کو اپنے کسی اور جرنیل کو تکلیف دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی، آپ کا یہ نمک خوار سپاہی منگولوں کی چیرہ دستی کے سامنے سینہ سپر ہو کر اپنے زور بازو سے انہیں پسپائی اور شکست کے گڑھوں میں دفن کردے گا۔''

''شاباش.....'' سلطان نے خوش ہو کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور اس کا اشارہ پا کر دیگر لوگوں نے ''سبحان اللہ'' کا نعرہ بلند کیا۔

☆.....☆.....☆

غیاث الدین تغلق اور مخدومہ جہاں جب واپس دیپال پور پہنچے تو دونوں اپنی اپنی جگہ بے حد خوش تھے۔ غیاث عہدے اور سلطان کی عنایت و تعریف سے شاداں و فرحاں تھا تو مخدومہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعا سے بے حد خوش تھی۔ اُسے اللہ کی ذات سے پوری امید تھی کہ وہ رب مہربان اپنے اس فقیر عبادت گزار کی دعا رد نہیں کرے گا۔

اور اس کی یہ امید جلد ہی بر آئی۔ وہ امید سے ہو گئی تھی۔

پوری حویلی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ غیاث الدین کی ماں رحمت خداوندا، اس کا نوجوان بھائی رجب اور جواں سال بہن فردوس سب ہی بے حد مسرور و شاداں تھے۔ سپہ سالار سیف الدین سے فردوس کا رشتہ طے ہو چکا تھا اور آنے والے ماہ رجب میں اس کی شادی قرار پائی تھی۔

رحمت خداوندا اپنی زندگی میں فردوس اور رجب کی شادی سے فارغ ہو جانا چاہتی تھی۔ وہ جیتے جی غیاث الدین کی اولاد کو دیکھنے کی آرزومند تھی، سو خداوند رحیم نے اس کی یہ آرزو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا سامان کر دیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے نو ماہ بیت گئے۔

وہ ایک خوبصورت سرمئی شام تھی۔ آسمان پر سرمئی اودے بادل اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ ہوا کے نرم جھونکوں میں نو شگفتہ گلوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

غیاث الدین تغلق اس وقت اپنے چند معتبر اور نزدیکی مصاحبوں کے ساتھ نشست گاہ میں موجود تھا۔ ان سب کی نگاہیں نیم وا دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جبکہ کان خوشخبری سننے کے لئے منتظر و مضطرب تھے۔

شادی کے پورے دس سال بعد غیاث الدین تغلق اپنے گھر میں بچے کی ولادت کی خبر سننے کا منتظر تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک خوبرو، ذہین، بہادر اور دانا بیٹے کا باپ بنے گا، جس کا نام ''جونا خان'' اس نے بہت پہلے سے سوچ رکھا تھا۔

(جاری ہے)

غیاث الدین کا دلکش گلابی چہرہ جذبۂ انبساط سے گلنار ہو گیا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ غزالی آنکھوں سے شادمانی مترشح تھی۔ اس کا شیر جیسا دل فرطِ مسرت سے بلیوں اُچھل رہا تھا۔

"خدا نے آپ کو چاند سا بیٹا عطا کیا ہے۔" خادمہ کی مترنم آواز روشنی بن کر ہر سو بکھر گئی تھی۔

"آپ کو بیٹے کی ولادت مبارک ہو۔" اس کے احباب و مصاحبین نے بیک زبان ہو کر اسے مبارک باد دی۔

مسکان گم ہو گئی

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

قسط: 2

"کیا میں اپنے لختِ جگر کو دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے دھڑکتے دل سے خادمہ سے سوال کیا۔

"کیوں نہیں سرکار۔" خادمہ نے بصد احترام جواب دیا۔ "تشریف لے چلئے۔"

مخدومہ جہاں کو نومولود سمیت خواب گاہ میں پہنچا دیا گیا تھا۔

اس وقت اس کے پاس اس کی ساس رحمتِ خداوندا موجود تھی۔ پہلے پوتے کی ولادت پر وہ بے حد مسرور تھی۔ بچے کے چچا رجب اور پھوپھی فردوس کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ ان کے باپ کی وفات کے بعد انہیں باپ بن کر پالنے والا بھائی، آج حقیقت میں باپ بن گیا تھا۔

غیاث الدین لمبے لمبے ڈگ بھرتا مخدومہ جہاں کے کمرے کے دروازے تک آ پہنچا تھا۔

"پل بھر کو ذرا ٹھہرئیے سرکار۔" دائی راز بھری کہ جس کے ہاتھوں بچہ تولد ہوا تھا، نے آگے بڑھ کر غیاث الدین کا راستہ روکتے ہوئے مودب لہجے میں کہا۔ "پہلے، شاہ زادے کا صدقہ، اس کنیز کو عطا کر دیجئے...... پھر شاہ زادے کا چہرہ دیکھئے گا۔"

غیاث الدین کے خوشی سے تمتماتے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اُس نے ایک لاکھ ٹنکہ راز بھری کو انعام کے طور پر دینے کا اعلان کیا۔ اس انعام کے بعد وہ دائی "لکھ بھری" کے نام سے معروف ہوئی۔

دائی کے راستہ چھوڑتے ہی وہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔

"فرزند ارجمند بانصیب و باسعادت، تمہیں مبارک ہو لختِ جگر۔" اس کی ماں نے گود میں تھامے نرم و نازک سے بچے کو غیاث الدین کی طرف بڑھاتے ہوئے مسرور لہجے میں کہا۔

غیاث الدین نے بے ساختہ بازو پھیلا کر بچے کو اپنی آغوشِ محبت میں سمیٹ لیا۔ اس کی چشمِ تشنہ کو تسکین اور قلبِ محروم کو قرار مل گیا تھا۔

"جانِ پدر" اس نے ننھے شہزادے کو سینے سے لگاتے ہوئے مشفق لہجے میں سرگوشی کی۔ "جونا خان! میرے لختِ جگر تم تازیست، مجھے دنیا کی ہر شے سے زیادہ عزیز رہو گے۔"

مخدومہ جہاں درخشاں آنکھوں سے خاوند کی فرزند سے محبت کا منظر دیکھ رہی تھی۔ فرطِ مسرت سے اس کی آنکھیں اشکبار تھیں، بارِ تشکر سے دل بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز تھا۔

"مادرِ محترمہ، میں نے بچے کا نام جونا خان تجویز کیا ہے، آپ کی کیا رائے ہے؟" غیاث الدین نے ماں کی طرف متوجہ ہو کر سوال کیا۔

"بہت خوبصورت اور مبارک نام ہے۔" رحمتِ خداوندا نے بیٹی فردوس کی طرف تائید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"بے شک بے حد اچھا اور مناسب نام ہے۔" فردوس نے خوشی سے کھنکتی آواز میں نام کو شرفِ قبولیت بخشا۔ ٹھیک اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"کیا میں اپنے عزیزم بھتیجے کو دیکھنے کے لئے اندر آ سکتا ہوں۔" نیم وا دروازے کے اس پار سے رجب کی آواز اُبھری تھی۔

"اندر چلے آؤ۔" غیاث الدین نے دروازے کی جانب رخ کر کے مسکراتی آواز میں جواب دیا۔ "بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے ہمیں تمہارا ہی انتظار تھا۔"

بھائی کا جواب سنتے ہی رجب کمرے کے اندر چلا آیا۔ پھر اس نے نومولود کو آغوش میں لے کر اس کے کان میں اذان دی اور فرطِ محبت سے اس کی دمکتی پیشانی کو چوم لیا۔

19 سالہ رجب کی خوبصورت آنکھوں سے مسرت و انبساط کے سوتے پھوٹ رہے تھے۔ چاند سا بھتیجا پا کر وہ خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

پہلے فرزند کی ولادت پر غیاث الدین کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اس کے حکم پر ساری حویلی کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا تھا۔ شہر بھر میں خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ صوبے بھر میں غرباء اور مساکین میں خیرات تقسیم کی گئی۔

ولادت کے ساتویں روز عقیقہ مسنون کی رسم ادا کی گئی۔ رات کو ایک زبردست دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ ضیافت کے لئے ڈھائی ہزار بکرے ذبح کئے گئے۔ تقریب میں عمائدینِ شہر، امراء، علماء اور مشائخ دین نے بڑی تعداد میں شرکت کی اور غیاث الدین کو بیٹے کی مبارک باد دی۔

جونا خان کے عقیقے کے اگلے دن ہی غیاث الدین کو منگولوں کے حملے کی خبر ملی تھی۔ غیاث الدین کو بیٹے کی ولادت کی خوشی میں مگن پا کر وہ سرحدی علاقے پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ خبر ملتے ہی غیاث الدین تازہ دم فوج لے کر مقابلے کے لئے نکلا اور منگولوں پر آسمانی بجلی کی طرح کڑک کر گرا۔ منگولوں نے مقابلے کی کوشش کی مگر چند گھنٹوں میں ہی ان کے دانت کھٹے ہو گئے اور غیاث الدین کامیاب و کامران واپس لوٹا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال بیت گیا۔

اس ایک سال کے دوران منگولوں نے تین بار سرحدی علاقوں پر ہلا بولا اور غیاث الدین نے ہر بار انہیں شکستِ فاش دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کی اس شاندار کارکردگی پر، سلطان علاء الدین خلجی کی طرف سے اسے "غازی ملک" کے خطاب سے نوازا گیا اور لباسِ فاخرہ عطا کیا گیا۔

سال کے پورے ہوتے ہی خدا نے اسے ایک اور بیٹے سے سرفراز کیا۔ غیاث الدین غازی ملک نے اپنے دوسرے بیٹے بہرام خان کی ولادت پر بھی حسبِ سابق خوشی منائی۔

فردوس کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک چاند سے بیٹے کی ماں بن چکی تھی۔ غازی ملک اور فردوس کی طرف سے بے فکر ہو کر اب رحمتِ خداوندا کی ساری توجہ اپنے چھوٹے بیٹے رجب کی طرف تھی۔ اب وہ کافی نحیف و لاغر ہو گئی تھی اور ملکِ عدم کو سدھارنے سے قبل وہ رجب کے سر پر سہرا دیکھنے کی آرزومند تھی اور اس مقصد کے لئے وہ آج کل تگ و دو میں لگی ہوئی تھی مگر رجب تھا کہ کوئی لڑکی اس کی پسند کے پیمانے پر پوری ہی نہ اُترتی تھی۔

رجب ایک خوبرو اور ذہین نوجوان تھا۔ وہ شعر و ادب کا دلدادہ تھا۔ خود بھی اشعار لکھتا تھا۔ شعر و ادب اور موسیقی نے اس کے مزاج میں ایک عجب سی نزاکت اور ندرت پیدا کر دی تھی، تصور میں اس کے خیال نے ایک ایسا پیکر تراشا تھا، جس نے اسے ہر حسین چہرے سے بیگانہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے خیالی پیکر کے تصور میں رات دن گم رہتا تھا۔ اس انجانی ان دیکھی دوشیزہ کا دلکش کتابی چہرہ، غزالی جادو بھری آنکھیں، لمبی مشکبار زلفیں، سانچے میں ڈھلا پُرشباب جسم اور شاخِ گل سے لچکتے گداز بازو...... ہر لمحہ رجب کے دل و دماغ پر چھائے رہتے۔

"خدا جانے اس نے اپنے مستقبل کے بارے میں کیا سوچ رکھا ہے۔" اس شام رحمتِ خداوندا، مخدومہ جہاں کے پاس بیٹھی رجب کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ "مخدومہ تم ہی اسے سمجھاؤ کہ اب اس کی شادی کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس شوال میں وہ خدا کے فضل سے پورے اکیس برس کا ہو جائے گا...... اس عمر میں اس کے بابا جان، تین بچوں کے باپ بن چکے تھے۔"

"آپ متفکر نہ ہوں اماں جان۔" مخدومہ جہاں نے تشفی دینے والے انداز میں ساس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "موقع ملتے ہی میں خود بھائی رجب سے اس سلسلے میں بات کروں گی...... اور مجھے خدا کی ذات سے امید ہے کہ وہ اپنی بھابی کی بات کو رد نہیں کریں گے۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" رحمتِ خداوندا نے آسمان کی سمت دیکھ کر حسرت بھرے لہجے میں کہا اور تکیہ پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

شام کو جب رجب اپنے چہیتے بھتیجے جونا خان کے ساتھ لاڈ پیار میں مصروف تھا تو مخدومہ جہاں اس کے قریب چلی آئی۔ اس وقت رجب، جونا خان کو گود میں لئے کھلا رہا تھا۔ رجب کو اپنا یہ بھتیجا بے حد پیارا تھا، وہ تاحیات جونا خان سے والہانہ محبت کرتا رہا۔

"رجب......" مخدومہ نے اخلاص بھرے لہجے میں دیور کو آواز دی۔ "کیا تمہارا دل نہیں چاہتا کہ جونا خان کی طرح تمہارے گھر میں بھی چاند سا بیٹا ہو۔"

"مجھے یہ جونا خان ہی بیٹے کی طرح عزیز ہے۔" رجب بھاوج کی بات کا مفہوم سمجھتے ہوئے بھتیجے کو گلے سے لگاتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"ٹھیک ہے بھائی اور بہن کے بچے اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز ہوتے ہیں۔" مخدومہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "مگر زندگی میں اپنے بچوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

رجب نے بھابی کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ سر جھکائے جونا خان کے ننھے ننھے ہاتھوں کو ہلاتا رہا۔

"تمہیں معلوم ہے، اماں جان تمہاری وجہ سے کس قدر متفکر ہیں۔" اسے خاموش پا کر مخدومہ نے بات آگے بڑھائی۔ "تمہارے بھائی کو بھی آرزو ہے کہ تمہاری شادی ہو، تمہارا گھر آباد ہو۔ آخر تم شادی کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہو جاتے؟"

"میں نے شادی سے کب انکار کیا ہے؟" رجب سر کھجاتا ہوا شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔ "مگر میں کسی اجنبی انجانی لڑکی کے ساتھ شادی نہیں کر سکتا۔"

"تو یہ کونسا مشکل مرحلہ ہے، جس لڑکی کو تمہارے لئے منتخب کیا جائے گا، اسے تمہیں پہلے سے دکھایا جا سکتا ہے۔" مخدومہ نے جلدی سے کہا۔

"نہیں بھابی جان، میری بات کا یہ مطلب نہیں تھا۔" رجب نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ میرے تصور میں ایک چہرہ ہے...... دل و دماغ پر ایک پیکر چھایا ہوا ہے...... میں اسی چہرے کی تلاش میں ہوں، وہ جس دن جہاں مجھے نظر آئی، میں فوراً ہی شادی کے لئے آمادہ ہو جاؤں گا۔"

"تمہارا وہ خیالی پیکر تمہیں جب بھی مل جائے تو سب سے پہلے مجھے بتانا، میں کسی بھی قیمت پر اسے تمہاری دلہن بنا کر لے آؤں گی۔" مخدومہ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا اور رجب کے باریک گلابی لبوں پر بھی محجوب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے تین برس اور بیت گئے، اب غازی ملک پانچ بیٹوں کا باپ بن چکا تھا اور رجب ہنوز غیر شادی شدہ، اپنے خیالی پیکر کی تلاش اور جستجو میں سرگرداں تھا۔

☆......☆......☆

بھوری خاکستری پہاڑیوں کے دامن میں دور تک پھیلا سرسبز و شاداب جنگل پٹیالے کی ترائی تک چلا گیا تھا۔ جنگل کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے کئی گاؤں اور قصبے آباد تھے۔ رجب اپنے دو ساتھیوں، اقبال مند اور خواجہ خان کے ساتھ شکار کی غرض سے کل شام سے اس جنگل میں خیمہ زن تھا۔

سورج کے طلوع ہوتے ہی وہ تنومند اور تیز رفتار گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ شکار کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ جنگل چھوٹے جانوروں کے شکار کے لئے بہت مشہور تھا۔ خصوصاً ہرن اور جھنکاڑ نما سینگوں والے بارہ سنگھے یہاں بافراط دستیاب تھے۔

وہ تینوں ایک ساتھ گھنے جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے، تب ہی قد آدم جھاڑیوں کی اوٹ سے رجب کو ایک آہو چشم کی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ اپنی غزالی آنکھوں سے نو وارد گھڑ سواروں کو دیکھ رہا تھا۔ انہیں اپنی جانب بڑھتے دیکھ کر اس کی کالی چمکدار آنکھوں میں دہشت اُتر آئی تھی اور وہ اُچھل کر سامنے کی جھاڑیوں کی طرف دوڑ پڑا تھا۔ رجب نے فوراً گھوڑا اس کے تعاقب میں ڈال دیا۔

ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالتے وقت رجب نے سوچا بھی نہ تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں اور ٹھکانے سے بچھڑ جائے گا...... ہرن تو کچھ دیر میں قلانچیں بھرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا مگر رجب اب اپنے راستے سے بھٹک چکا تھا۔

وہ دوپہر تک جنگل میں بھٹکنے کے بعد ایک بستی میں نکل آیا تھا۔ زین کے ساتھ لٹکی اس کی چمڑے کی چھاگل خالی ہو چکی تھی اور سخت پیاس سے اس کے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ وہ تلاشِ آب میں بستی میں داخل ہو گیا۔

کچھ دور چل کر اُسے کھیتوں کے سامنے ایک پن گھٹ نظر آیا۔ وہ گھوڑا دوڑاتا اس سمت نکل آیا۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر پن گھٹ پر پانی بھرتی پن ہاریوں نے چونکتا ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

رجب گھوڑے سے اُتر آیا۔ اس نے گھوڑے کو قریبی پیڑ کی ایک نیچی سی شاخ سے باندھ کر قدم پن گھٹ کی طرف بڑھا دیئے تھے۔

"تم کون ہو؟" نوجوان دیہاتی لڑکیوں نے اس خوبرو نوجوان کو حیران اور ستائش بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "پہلے تو کبھی تمہیں اِدھر نہیں دیکھا؟"

"میرا نام رجب ہے۔ میں ایک اجنبی ہوں۔ راہ بھٹک کر اس طرف آ گیا ہوں۔" رجب نے نگاہیں جھکا کر مسکراتے ہوئے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "میں سخت پیاسا ہوں، کیا مجھے دو گھونٹ پانی مل جائے گا۔"

اس سے پہلے کہ وہ سادہ لوح پن ہاریاں کوئی جواب دیتیں، ایک کرخت اور نخوت بھری آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہرگز نہیں، یہاں مسلوں کا داخلہ سخت منع ہے، کسی اچھوت کی پرچھائیوں سے ہی پن گھٹ کا سارا پانی نجس ہو جائے گا۔"

رجب نے پلٹ کر آواز کی جانب دیکھا۔ سامنے ایک پندرہ سولہ برس کی لڑکی متکبرانہ انداز میں سر اونچا کئے نخوت سے تنی کھڑی تھی۔

رجب کی نگاہیں اس کے سراپا پر پڑیں تو گویا پلٹنا ہی بھول گئیں۔ اس کا خیالی پیکر، حقیقت کے روپ دھار کر اس کی نظروں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ وہی چہرہ، وہی ابرو، وہی لب، وہی گیسو...... رجب دم بخود مبہوت سا اُسے دیکھے گیا۔

اس کے اس طرح دیکھنے سے لڑکی کی شفاف پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"اس طرح کیا تکتا ہے؟" اس نے ترش لہجے میں کہا۔

"اپنے خواب کی تعبیر دیکھ رہا ہوں۔" رجب نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے بے خود سے لہجے میں جواب دیا۔ "جو تصویر برسہا برس سے میرے دل و دماغ میں بسی ہوئی تھی، آج روبرو اُسے دیکھ رہا ہوں۔"

"کیا بکتا ہے؟" لڑکی نے غصیلے لہجے میں کہا اور خونخوار انداز میں اس کی طرف بڑھی۔

"نائلہ! بھگوان کے لئے اسے شما کر دو...... کوئی دیوانہ دکھتا ہے۔" لڑکیوں نے جھرمٹ سے ایک لڑکی ہاتھ جوڑے لڑکی کی طرف لپکی اور وہ لڑکی کہ جس کا نام نائلہ تھا، پل بھر کو اپنی جگہ رک گئی۔

"اسے کہہ دو تندنی کہ یہاں سے چلتا پھرتا نظر آئے۔" نائلہ نے اپنے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑی لڑکی کو مخاطب کر کے، رجب کی طرف نفرت بھرے انداز میں ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے غصیلے اور کڑوے لہجے میں کہا...... "ورنہ مجھے غصہ آ گیا تو...... بہت ہی برا ہو گا۔"

"تمہیں شاید کسی نے نہیں بتایا کہ تم جب بگڑتی ہو تو اور سنور جاتی ہو۔" رجب خان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "اب تم ہی کہو، برسوں کے انتظار اور تلاش کے بعد تمہیں پایا ہے، بھلا تمہیں چھوڑ کر میں کس طرح جا سکتا ہوں۔"

نائلہ کی سکھیاں اُسے زبردستی کھینچ کر ساتھ لے کر گھر کی جانب چل دیں اور رجب پانی کی پیاس بھول کر، آنکھوں کی پیاس بجھاتا اس کے پیچھے چل دیا۔

نائلہ مضافاتی دیہات روپ گڑھ کے مکھیا سیوک رام کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی، دولت کی ریل پیل اور بے جا لاڈ پیار نے اسے منہ پھٹ، بدزبان، ضدی اور سرکش بنا دیا تھا۔ کچھ بے پناہ حسن کا غرور بھی تھا۔ بقول شاعر، خدا حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے، کے مصداق وہ کسی کو بھی اپنا ہم پلہ نہ گردانتی تھی۔

اس دیہات میں سارے ہندو جاتی کے لوگ ہی آباد تھے۔ مکھیا سیوک رام ایک متعصب ہندو تھا۔ اس نے تمام گاؤں کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید نفرت بھر رکھی تھی۔ خاص طور پر اس کی بیٹی نائلہ کے دل میں مسلمانوں کے خلاف شدید زہر بھرا ہوا تھا۔ اس کے نزدیک مسلمان اچھوت اور نجس تھے مگر آج اس مسلمان لڑکے کی گستاخی دیکھ کر وہ سلگ اٹھی تھی۔ اپنی سکھیوں کے ہاتھ پیر جوڑنے پر وہ رجب کو بنا کچھ کہے گھر کی جانب چل دی تھی۔ مگر اب رجب کو اپنے پیچھے آتے دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو اٹھی تھی۔

اپنی اونچی حویلی کے سامنے پہنچ کر اس نے پلٹ کر خواب کی سی کیفیت میں چلتے، اپنے پیچھے آتے، رجب کی طرف دیکھا تھا۔

"یہ مورکھ ایسے نہیں سمجھے گا۔" وہ دانت پیس کر بولی اور پاؤں پٹختی اپنے گھر کے اندر چلی گئی۔

"بھگوان کے لئے تم چلے جاؤ۔" نائلہ کے جانے کے بعد تندنی ہاتھ جوڑتے ہوئے رجب کی طرف بڑھی۔ "کیوں اپنے جیون کے بیری ہوئے ہو، اپنی اس جوانی پر ہی کچھ ترس کھاؤ۔"

"یہ جوانی اور یہ زندگانی دونوں ہی بے کار اور بے معنی ہیں، اگر وہ میرے ساتھ نہیں۔" رجب نے حویلی کے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

"میں تم سے التجا کرتا ہوں، اس سے جا کر کہو کہ میں نے برسوں اُسے تلاش کیا ہے، برسوں اس کا انتظار کیا...... اب وہ مجھ سے دور نہ جائے ورنہ اس کا یہ دیوانہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گا۔"

"تو مرنا چاہتا ہے نا...... تو لے سنبھال اپنی موت۔" اگلے ہی لمحے نائلہ دندناتی ہوئی باہر نکلی، اس کے پیچھے چھ سات مسٹنڈے تیل پلائی لاٹھیاں لئے برآمد ہوئے تھے۔

"اسے اتنا پیٹو کہ اس کا دم نکل جائے، پھر اس کی لاش اٹھا کر جنگل میں پھینک دینا۔"

نائلہ کا حکم سنتے ہی لاٹھی بردار خدام رجب پر ٹوٹ پڑے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے دم ہو کر زمین بوس ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

شام کے سرمئی سائے رات کی سیاہیوں سے ہم آہنگ ہوتے جا رہے تھے۔ جوں جوں اندھیرا بڑھ رہا تھا، رحمتِ خداوندا کا دل گھٹ رہا تھا۔ رجب کو آج تین روز ہو گئے تھے گھر سے گئے۔ وہ دو روز کا کہہ کر شکار کے لئے روانہ ہوا تھا، یہ آج چوتھی رات لگ گئی تھی۔

"مخدومہ میرا دل سخت پریشان ہے، خدا جانے کیا معاملہ ہوا۔" وہ بہو سے اپنے اضطراب کا تذکرہ کر رہی تھی۔ "رجب کو گئے آج تین روز ہو گئے۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" مخدومہ نے ساس کے کاندھے پر ہمدردانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ "ہو سکتا ہے کہ کوئی شکار ہاتھ نہ لگا ہو تو، ان لوگوں نے سوچا ہو کہ ایک آدھ دن اور دیکھ لیں۔"

"پتہ نہیں کیوں...... میرا دل کوئی بھی تاویل ماننے کو تیار نہیں ہے۔" ماں نے بے تاب لہجے میں جواب دیا۔ "خدا خیر کرے...... میری بائیں آنکھ بھی پھڑک رہی ہے۔ خدا میرے دونوں بیٹوں کو زندہ سلامت رکھے۔"

"آج کل غازی ملک بھی منگولوں کے ایک حملے سے نبٹنے کے لئے سرحدی پٹی پر گیا ہوا تھا۔"

رات دبے پاؤں آگے بڑھتی رہی اور ماں کی بے چین سوچوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ آدھی رات کے وقت دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ رحمتِ خداوندا کی آنکھیں نیند سے خالی، اونچی چھت کی کڑیوں پر لگی تھیں۔ دستک کی آواز سنتے ہی وہ بے تابانہ اُٹھ بیٹھی اور تیزی سے صحن کو عبور کرتی بیرونی دروازے پر پہنچ گئی۔

"کون ہے؟" اس نے دروازہ کھولنے سے پہلے سوال کیا۔

"ماں جی دروازہ کھولئے۔" رجب کے ساتھیوں میں سے ایک کی آواز سنائی دی۔ "میں ہوں خواجہ خان۔"

رحمتِ خداوندا نے دھڑ سے دروازہ کھول دیا۔ سامنے اقبال مند اور خواجہ خاں ہیبت زدہ چہرے لئے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ایک گٹھری سی تھی، جو جا بجا لہو سے سرخ تھی۔

"میرا رجب خان کہاں ہے؟" ماں نے بے قراری سے سوال کیا۔ "وہ تمہارے ساتھ گیا تھا تمہارے ساتھ واپس کیوں نہیں آیا؟"

"وہ ہمارے ساتھ ہی ہے۔" اقبال مند نے گٹھری کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ اس گٹھری میں ہے۔"

"کیا......؟" ماں آنکھیں پھاڑے منہ کھولے ان دونوں کی طرف تکنے لگی۔ وہ دونوں گٹھری سنبھالے صحن میں آ گئے تھے، سامنے بچھی کھاٹ پر انہوں نے گٹھری رکھ کر اُسے کھول دیا۔

اب کھاٹ پر رجب کا زخموں سے چُور وجود نظر آ رہا تھا۔

"کیا یہ مر چکا ہے؟" ماں نے دہشت زدہ لہجے میں سوال کیا اور اس کے ساتھیوں کے جواب سننے سے پہلے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر ڈھیر ہو گئی۔

مخدومہ جہاں اپنی خواب گاہ سے نکل آئی تھی۔ اس کے ساتھ سات سالہ جونا خان بھی تھا۔ جونا خان اپنے چہیتے چچا کی یہ حالت دیکھ کر سخت مضطرب ہوا تھا۔

مخدومہ نے بنا کوئی سوال کئے دیور کی نبض ٹٹول کر دیکھی۔ مضروب وجود میں ابھی سانس کی رمق باقی تھی، اس نے خدام کو دوڑایا کہ وہ طبیب کو بلا لائیں۔

خادماؤں کو اشارہ کیا کہ وہ بے ہوش رحمتِ خداوندا کو اندر لے جا کر لٹائیں اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کریں جبکہ وہ خود رجب کی دیکھ بھال میں جُت گئی۔

اطباء کی شبانہ روز کوششوں کے بعد آخر دسویں دن رجب خان نے آنکھیں کھولیں۔ کندھوں، پشت سے گوشت اُدھڑ چکا تھا بلکہ کچھ ہڈیاں بھی مضروب ہوئی تھیں۔ مکمل طور پر ٹھیک ہونے میں پورے تین ماہ لگ گئے۔

غازی ملک واپس لوٹ آیا تھا۔ وہ اکلوتے اور چہیتے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر بے قرار ہو گیا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں کہ میری ہی صوبیداری میں میرے بھائی کے ساتھ یہ سلوک کس نے کیا، مجھے اس بدبخت کا نام بتاؤ، میں اس کی کھال اُدھڑوا کر بھس بھروا دوں گا۔"

رجب خان نے غازی ملک اور ماں کے بے حد اصرار کے باوجود خود کو گھائل کرنے والے اپنے اس قاتل کا نام نہیں بتایا کیونکہ وہ دشمنِ جاں اسے جان سے پیاری تھی۔

"رجب میرے بھائی! کیا تم مجھے بھی کچھ نہ بتاؤ گے؟ رجب کے تقریباً پوری طرح ٹھیک ہو جانے کے بعد ایک شام مخدومہ جہاں نے اس سے سوال کیا۔

"بھابی جان، آپ کو بتائے بنا چارہ بھی تو نہیں ہے۔" رجب خان بے بسی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "پر میں کچھ بتانے سے پہلے آپ کو آپ کا ایک وعدہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔"

"وعدہ...... کون سا وعدہ؟" مخدومہ جہاں نے بھویں سکیڑ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔

"ایک دن میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا تصوراتی محبوب جب مجھے حقیقت کے روپ میں مل جائے گا تو میں سب سے پہلے اس کے بارے میں آپ کو بتاؤں گا اور آپ اسے کسی بھی قیمت پر، ہر حال میں، میری دلہن بنا کر گھر لے آئیں گی...... یہی وعدہ کیا تھا نا آپ نے؟"

"اوہ!" مخدومہ کے گداز لب حیران انداز میں سمٹ گئے۔ "تو کیا تمہیں تمہارا خیالی پیکر مل گیا ہے؟"

"جی بھابی جان۔" رجب خان نے دور خلاؤں میں اُداس نظروں سے گھورتے ہوئے، کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔ "وہ ہو بہو ویسی ہے جیسا میں نے سوچا تھا...... مگر میں نے یہ کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ میری محبوبہ بننے کی بجائے میری دشمنِ جاں ثابت ہو گی......"

رجب خان نے نگاہیں جھکا کر نائلہ سے ملنے اور اس کے ظالمانہ سلوک کی ساری کہانی من و عن بیان کر دی۔

اس کا مطلب ہے کہ اس ہندو لڑکی کے دل میں مسلمانوں کے لیے تعصب اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہے...... "سب کہانی سن کر مخدومہ جہاں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "تم ہی کہو، اس پتھر دل کو کس طرح برمایا جا سکتا ہے...... یہ کام تو مجھے مشکل دکھائی دیتا ہے۔"

رجب خان نے بھابی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھا اور خاموشی سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔

گو کہ اب وہ پوری طرح صحت مند ہو گیا تھا مگر اس کے چہرے کی زردی اور آنکھوں کی اداسی اب تک باقی تھی۔ رات دن نائلہ کے فراق میں وہ آہیں بھرتا اور گیلی لکڑی کی طرح سلگتا رہتا تھا۔

اتو جان، کیا بات ہے...... آپ اس قدر افسردہ کیوں ہیں؟ سات سالہ جونا خان دور بیٹھا عزیز چچا کے اداس چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔

"تم نہیں سمجھو گے پیارے۔" رجب خان نے پیار سے بھتیجے کے پھولے ہوئے گلابی رخسار تھپتھپائے۔

"آپ بتایئے تو......" جونا خان نے مصر لہجے میں کہا۔ "استاد محترم کہتے ہیں کہ میں بہت ذہین ہوں اور اپنی عمر سے بہت آگے سوچتا اور سمجھتا ہوں۔"

"اچھا۔" رجب خان نے معصوم بھتیجے کی بات سن کر مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ بات ہے۔"

"جی! آپ اپنی افسردگی کی وجہ مجھے بتائیں، ہوسکتا ہے میں آپ کی کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔"

"تم اگر کوئی مفید مشورہ نہ بھی دے سکے تو...... کم از کم میرے دل کا بوجھ تو کم ہو جائے گا۔" رجب خان نے نو عمر بھتیجے کو قریب بٹھاتے ہوئے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے بھائی جان سے بہت توقع تھی کہ وہ ضرور میری مدد کریں گی مگر ان کے جواب نے مجھے مایوس کیا ہے...... وہ لحظہ بھر کو چپ ہو گیا۔ پھر بولا۔ "مجھے امید تھی کہ ان کی مدد سے میں اپنی محبت کو پالوں گا...... مگر اب......"

"محبت......؟" ننھے جونا خان نے سوالیہ نظروں سے نوجوان چچا کی طرف دیکھا۔

"تم نہیں سمجھو گے۔" رجب بے بسی سے مسکرایا...... "اور شاید میں سمجھا بھی نہیں سکوں گا کہ یہ محبت آخر چیز کیا ہے؟"

"میں جانتا ہوں۔" جونا خان مدبرانہ انداز میں مسکرایا۔ "دانا کہتے ہیں، محبت مسکراہٹ سے شروع ہو کر آنسوؤں پر ختم ہوتی ہے۔"

"نہیں جونا خان۔" رجب خان نے تڑپ کر کہا۔ "محبت تو زندگی کی معراج ہے، زندگی ایک پھول ہے اور محبت اس کی خوشبو...... اور میری محبت ایک ہندو لڑکی نائلہ ہے جسے مسلمانوں سے سخت نفرت ہے، اس ناتے وہ مجھ سے اتنی ہی نفرت کرتی ہے، میں جس قدر اسے چاہتا ہوں...... میں اس کے بغیر زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا......"

"سچ ہی کہا ہے کسی دانا نے۔" جونا خان تدبر سے مسکرایا۔ "محبت وہ کھیل ہے جس میں عقل ہار جاتی ہے۔"

نیم وا دروازے کے باہر کھڑا غازی ملک نوجوان بھائی اور نو عمر بیٹے کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ وہ بھائی کی دیوانگی اور بیٹے کی فرزانگی پر حیران ہو رہا تھا۔

اسے اپنے پہلوٹھی کے بیٹے جونا خان پر شروع ہی سے ناز تھا۔ اس کی ذہانت اور طلب علم کے شوق نے ہمیشہ ہی اسے متاثر کیا تھا۔ اسی لیے اس نے اس کے لیے بہترین اساتذہ کا انتظام کیا تھا۔ مگر آج اس کی ذہانت بھری باتیں سن کر اسے حیرت بھری مسرت ہوئی تھی۔

غازی ملک کو اپنا بھائی رجب بھی بے حد عزیز تھا۔ اس کی خوشیوں کی خاطر وہ کچھ بھی کرسکتا تھا۔ سو اس نے سب سے پہلے رائج طریقہ اختیار کیا اور اپنی ماں اور بیوی کے ذریعے، روپ گڑھ کے مکھیا، سیوک رام کے گھر اس کی بیٹی کا رشتہ بھیجا تھا۔

"کیا۔؟" نائلہ کی صبیح پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ "وہ مورکھ زندہ بچ گیا؟"

"نا صرف زندہ ہے...... بلکہ اس نے رانی جی کا ہاتھ بھی مانگا ہے۔" نندنی نے شریر لہجے میں جواب دیا۔ "جانتی ہو وہ کون ہے؟ وہ پنجاب کے گورنر غازی ملک کا بھائی ہے......"

"ہوا کرے۔" نائلہ نے نخوت سے جواب دیا۔ "مجھے اس مسلّے سے کیا لینا دینا...... مجھے تو اس کی ہمت پر حیرت ہے...... اس قدر پٹنے کے بعد نا صرف زندہ رہا بلکہ پھر میرے بارے میں سوچنے کی جرأت کی۔"

"رانی جی! اسی کا نام پریم ہے۔" نندنی نے آنکھیں مٹکا کر جواب دیا۔

"چھی۔" نائلہ نے نفرت سے منہ پھیر کر کہا۔ "میں ایک مسلمان سے پریم کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی...... اس کے ساتھ جیون بتانے کے مقابلے میں، میں موت کو گلے لگانا زیادہ اچھا سمجھوں گی۔"

رحمتِ خداوندا اور مخدومہ جہاں نائلہ کا انکار سن کر واپس لوٹ آئی تھیں۔ محبوب کی بے رخی اور سنگ دلی نے رجب خان کے دل پر شدید اثر کیا تھا اور وہ بیمار ہو کر پلنگ سے لگ گیا۔ ننھا جونا خان رات دن چچا کی خدمت اور تیمارداری میں لگا رہتا اور اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑی، باتوں سے اسے سمجھاتا رہتا۔ مگر وہ عاشق ہی کیا جس پر کسی ناصح کی باتوں کا اثر ہو سکے۔

"رجب کی حالت دن بدن بگڑتی جارہی ہے۔ آپ کو اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا ہوگا۔" ایک رات مخدومہ نے تشویش بھرے لہجے میں غازی ملک سے کہا۔ "اس کی حالت دیکھ کر اماں جان بھی کمزور اور لاغر ہوتی جارہی ہیں......"

"تم ٹھیک کہتی ہو۔" غازی ملک نے دور خلاء میں کسی غیر مرئی نقطہ پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "اب پانی سر سے اوپر ہوتا جارہا ہے...... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔"

اور اگلے دن وہ اپنی فوج کے ایک دستے کے ساتھ روپ گڑھ کے مکھیا سیوک رام کی حویلی پر پہنچ گیا۔ اس نے سیوک رام کے سامنے رجب کا رشتہ رکھ کر اس سے نائلہ کا ہاتھ مانگا۔

"سرکار مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" عیار بنئے نے ہاتھ جوڑتے ہوئے خوشامدانہ لہجے میں جواب دیا۔ "یہ تو بھاگیہ کی بات ہے کہ آپ کے بھائی سے میری سپوتری کا بیاہ ہو، مگر کیا کروں...... وہ مکھو اس بیاہ پر راجی نہیں ہے...... اگر آپ اسے راجی کرلیں تو میری طرف سے ہاں ہے......"

تب غازی ملک نے نائلہ کو بلا کر اس کے سامنے اپنا سوال رکھا۔

"لڑکی! تمہارے باپ کو اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے...... تو تمہیں کس بات کی ضد ہے......"

"آپ اسے ضد کہیں نفرت یا غصہ......" نائلہ نے بے خوف لہجے میں جواب دیا۔ "مگر میں اسے صرف انکار کہتی ہوں...... مجھے انکار ہے...... کل بھی تھا...... آج بھی ہے...... اور مرتے دم تک رہے گا......"

"نائلہ"...... غازی ملک نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "تم اتنی کٹھور کس طرح ہوسکتی ہو...... ایک شخص تمہاری وجہ سے موت کے دہانے پر پہنچ گیا ہے...... کیا تم اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کرو گی......؟"

"ہرگز نہیں۔" نائلہ نے پتھریلے لہجے میں کہا۔ "میری طرف سے وہ کل کا مرتا آج مرجائے۔"

نائلہ کا جواب سنتے ہی غازی ملک غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا...... وہ ایک دم سے نائلہ کی طرف جھپٹ پڑے تھے۔

غازی ملک اپنے تیز رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر واپس جا چکا تھا۔

اس کے سپاہی نائلہ کو پابہ زنجیر لیے گھر پہنچے تھے۔

"رجب خان آنکھیں کھولو۔" سپاہی تیز خان نے رجب خان کو مخاطب کیا۔ وہ اس وقت بے خود و بے خبر بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ مرضِ عشق نے اتنا لاغر کر دیا تھا کہ اب اس میں بستر سے اٹھنے کی سکت بھی باقی نہ رہی تھی...... "اور دیکھو تمہاری آنکھوں کے سامنے کون ہے۔"

رجب نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولی تھیں اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں حیرت اور بے یقینی سے پھیل گئی تھیں۔

"نائلہ تم؟" اس نے نقاہت بھری حیران آواز میں سوال کیا تھا۔ "تم اس وقت یہاں کیسے؟"

"مجھے تمہارے بھائی کے یہ سپاہی زبردستی اُٹھا لائے ہیں۔" نائلہ نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ اُسے بھی رجب خان کو اس حالت میں دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ وہ سرخ و سفید صحت مند خوبرو نوجوان ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا اور چہرے پر ہلدی گھنڈی ہوئی تھی۔ بات کرتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی تھی اور سانس پھولتی تھی۔

"تیز خان۔" رجب نے غصیلی نظروں سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "یہ حرکت کرنے کی تمہیں جسارت کیسے ہوئی...... محبت خوشی کا سودا ہے، اسے زبردستی، تلوار کی نوک پر نہیں کیا جاسکتا...... جاؤ نائلہ کو عزت و احترام کے ساتھ اس کے گھر پہنچا کر آؤ......"

"مگر...... رجب خان...... تم خود اپنی جانب دیکھو۔ اس لڑکی کے عشق اور فراق میں تم بستر مرگ سے لگ گئے ہو...... اسی طرح چلتا رہا تو وہ دن دور نہیں جب تم......"

"مجھے اس کے فراق میں مرجانا قبول ہے...... مگر زبردستی اسے حاصل کرنا قبول نہیں۔"

رجب خان نے نقاہت کے باعث آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں کے بھیگے گوشے نائلہ کی حیران آنکھوں سے پوشیدہ نہ رہے تھے۔

نائلہ کو اس کو گھر واپس پہنچا دیا گیا۔

مگر چند گھنٹوں کے اس سفر نے اس کے سوچنے کا انداز بدل دیا تھا۔

سینے میں جلتی نفرت کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی...... اور دھڑکنوں میں ایک نئی آنچ روشن ہو گئی تھی...... رجب خان کی محبت کا انوکھا اور شدید انداز اسے حیران کر گیا تھا۔ اس کے عشق اور فراق میں موت کے دہانے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ اس کے لیے تڑپ رہا تھا مگر اسے زبردستی حاصل کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔

عجب تھی یہ محبت، اور عجب تھا اس محبت کا انداز...... جو اس کے دل پر اثر انداز ہوئے بنا نہ رہ سکا تھا...... اب ہر لحہ اس کی نگاہوں میں رجب کا پژمردہ چہرہ، مایوس آنکھیں پھرا کرتیں۔ اس کا شکستہ لہجہ، نقاہت میں ڈوبی آواز اس کی سماعت سے ٹکراتی رہتی...... دھڑکنوں میں ہر پل ایک خلش سی مچلتی رگوں میں لہو کے ساتھ ایک کسک محو گردش رہتی...... روح بے چین اور دل مضطرب رہتا۔

"یہ سب کیا ہے نندنی؟" وہ بے کل ہو کر اپنی سکھی سے پوچھتی......

"میں کیا بتاؤں...... کچھ ہی دنوں میں...... تم آپ سمجھ جاؤ گی۔" نندنی جواب دیتی۔

☆......☆......☆

غازی ملک دربار خلجی میں حاضری کے لئے دہلی کے لیے روانہ ہوا تو اس بار اس کے ساتھ مخدومہ جہاں اور جونا خان بھی تھے۔

مخدومہ جہاں خاص طور پر حضرت خواجہ کے آستانے پر سلام کرنے اور جونا خان کو ان کی خدمت میں سلام کے لئے لے جارہی تھی۔ جب سے جونا خان پیدا ہوا تھا، وہ اسی روز سے جونا خان کو لے کر ان کے آستانے پر جانے کی خواہش مند تھی، مگر حالات کچھ عجب رخ اختیار کرتے رہے، سال بہ سال بچوں کی ولادت، نندی کی شادی، بوڑھی ساس کی دیکھ بھال اور عاشقِ زار دیور کے دیوانہ وار عشق کے قضیے میں وہ یوں پھنسی کہ آٹھ سال گزر گئے اور وہ دہلی نہ جاسکی۔ پر اس بار اس نے ٹھان لی تھی کہ کسی بھی طرح وقت نکال کر وہ غازی ملک کے ساتھ دہلی ضرور جائے گی اور حضرت خواجہ کے آستانے پر حاضری دے گی۔ وہ جونا خان کو خواجہ نظام الدین اولیاءؒ سے ملوانے کی مشتاق تھی۔ وہ اپنے اس ذہین و فطین بچے بیٹے کے لیے ان کی دعاؤں کی خواستگار تھی۔ وہ رجب خان کی ناکام محبت کے لیے بھی دعا کرانا چاہتی تھی...... اور ساتھ ہی وہ ایک بیٹی کی آرزو مند تھی...... پانچ بیٹوں کے بعد وہ اب ایک بیٹی کی خواہش رکھتی تھی۔

حضرت خواجہؒ اس وقت اپنے حجرے میں تشریف فرما تھے۔ اولیاء کا دروازہ ہر پل ہر ایک کے لئے کھلا رہتا تھا۔ مخدومہ جہاں سات سالہ جونا خان کا ہاتھ تھامے آہستگی سے چلتی دروازے پر آ ٹھہری۔

آہٹ پر حضرت خواجہؒ نے نگاہ اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا اور ننھے جونا خان پر ان کی نگاہیں جم گئیں۔

جونا خان نے جھک کر سلام پیش کیا۔ حضرت خواجہؒ کے لبوں پر شفقت بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ انہوں نے نرم اور محبت بھرے لہجے میں سلام کا جواب دیا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

جونا خان نے ہاتھ تھام کر نہایت عقیدت سے ان کے ہاتھ کی پشت پر بوسہ ثبت کیا۔

"شکریہ سلطان دہلی۔" حضرت خواجہؒ کے لبوں پر بکھری مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔ مخدومہ جہاں کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ وہ کونے میں دبک کر بیٹھ گئی تھی۔

"سلطانہ بیگم۔" خواجہ نظام اولیاءؒ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "وہ بصیر و علیم، سننے والا اور دلوں کے بھید جاننے والا ہے...... آپ کی ہر دعا، بارگاہِ رب العزت میں باریاب ہے، رجب خان کا گھر بھی آباد ہوگا...... اور آپ کی گود میں بیٹی بھی کھیلے گی...... وہ رب کریم بے شک بہت مہربان اور دعاؤں کا سننے والا ہے۔"

مخدومہ جہاں واپس گھر پہنچی تو حسب سابق بے حد خوش اور شادمان تھی۔ مگر گھر پہنچ کر رجب خان کی حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی تھی۔ آتشِ عشق نے جلا کر اسے خاکستر کر دیا...... کوئی دم جاتا تھا کہ یہ خاک فضا میں منتشر ہونے کو بے کل تھی...... نائلہ کی راہ تکتی اس کی منتظر آنکھیں بند ہونے کو تھیں...... محبوب کے نام کی مالا جپتا دل کسی بھی پل...... رکنے والا تھا......

جواں بیٹے کو لب مرگ دیکھ کر رحمتِ خداوندا پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ جونا خان اشکبار آنکھوں کے ساتھ چچا کی پٹی سے لگ کر بیٹھ گیا تھا اور مخدومہ جہاں ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے رجب خان کی دگرگوں حالت دیکھ رہی تھی۔

تب ہی دروازے پر دستک ہوئی تھی۔ کسی خادمہ نے جا کر دروازہ کھولا اور کچھ ہی دیر بعد، تیزی سے چلتی نائلہ کمرے میں داخل ہوئی تھی...... وہ تیزی سے رجب کے بستر کی جانب بڑھی تھی...... وہ آنکھیں بند کیے آخری سانسیں گن رہا تھا۔

"رجب...... میرے پریتم۔" وہ رجب خان پر جھکتے ہوئے بے تاب لہجے میں بولی۔

"آپ ذرا دور رہیے......" بوڑھے حکیم نے ناگوار لہجے میں کہا۔ "ان آخری لمحوں میں اس طرح کی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

"آخری لمحے۔" نائلہ نے تڑپ کر کہا۔ "یہ بھلا مجھے چھوڑ کر کس طرح جاسکتے ہیں...... جب میں ان سے انجان تھی تو یہ میرا انتظار کرتے تھے، آج میں سب تیاگ کر ان کے قدموں میں آ گئی ہوں...... تو یہ مجھے چھوڑ کر کس طرح جاسکتے ہیں...... میں موت سے انہیں چھین لوں گی، میں بھگوان سے انہیں مانگ لوں گی......"

پھر وہ رجب خان کے بالکل قریب چلی آئی۔ "رجب خان...... میرے محبوب...... میرے پریتم...... آنکھیں کھولو...... دیکھو تمہاری محبت آخر رنگ لے آئی ہے...... اور میرا پتھر دل پیار کے تیشے سے ریزہ ریزہ ہو کر تمہارے قدموں میں بکھر گیا ہے...... آنکھیں کھولو...... اور میرے وجود کو سمیٹ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے، اپنی پناہ میں لے لو......"

رجب خان نے بصد مشکل دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں......

اس کے سامنے اس کی محبت، اس کا خیالی پیکر...... اس کی تصوراتی شبیہ۔ بال بکھرائے اشکبار آنکھوں کے ساتھ دامنِ دل پھیلائے کھڑی تھی......

"تم آ گئیں نائلہ......" اس نے بے حد دھیمی آواز میں حیرت او رسرت کے ملے جلے احساس سے پوچھا۔ "آخر تم آ گئیں......"

ہاں، میرے سوامی...... آخر تمہاری محبت جیت گئی اور میرا کٹھور من ہار گیا...... میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے چرنوں میں آ گئی ہوں...... میرے پریتم مجھے سویکار کرلو......"

رجب خان کے خشک پپڑی زدہ لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی......

محبت نے وہ معجزہ کر دکھایا تھا جس کی کسی حکیم اور طبیب کو امید نہ تھی۔

رجب کی طبیعت بحال ہونے لگی...... نائلہ اس کی بے دام باندی کی طرح رات دن اس کی سیوا میں لگی رہتی...... دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھر سے جی اٹھا...... اس کے ٹھیک ہوتے ہی غازی ملک نے اس کی اور نائلہ کی شادی بہت دھوم دھام سے کر دی تھی۔

نائلہ نے دل کی تمام گہرائیوں کے ساتھ اسلام قبول کرلیا تھا اور اس کا اسلامی نام بی بی کدبانو رکھا گیا۔

ہر طرف رنگ ہی رنگ تھے، خوشبو ہی خوشبو تھی، ہر چہرہ شاداب تھا اور ہر لب متبسم۔ رجب کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ آخر اس کے جذبۂ بے لوث نے اپنی منزلِ مقصود پالی تھی۔ غازی ملک بھائی کی خوشی دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سما رہا تھا۔

چچا سے بے پایاں محبت کرنے والے جونا خان کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ وہ ہر سمت مسرت سے لہراتا گنگناتا پھر رہا تھا۔

☆......☆......☆

وقت آہستہ روی سے آگے بڑھتا رہا...... مخدومہ جہاں ایک بار پھر امید سے ہو گئی تھی۔

اسے ہی نہیں اس کی ساس رحمتِ خداوندا کو بھی پورا یقین تھا کہ اب کی بار خدا کی رحمت کا نزول ہوگا۔ دادی کو پوتی کا بے حد انتظار تھا...... مگر پوتی کے دنیا میں آنے سے قبل ہی وہ دنیا سے رخصت ہو گئی۔

محبت کرنے والی ماں کی موت غازی ملک کے لیے کسی سانحہ سے کم نہ تھی۔ غازی ملک کے سب ہی بیٹے دادی سے بہت قریب تھے، مگر جونا خان ان کی آنکھ کا تارا تھا۔ دادی کی موت نے اسے بھی دلی رنج پہنچایا تھا اور ہفتوں، مہینوں گھر کی فضا طول و رنجیدہ رہی تھی۔

جاڑوں کی ایک ٹھٹھرتی رات کو مخدومہ جہاں نے ایک چاندی سی بیٹی کو جنم دیا تھا۔ غازی ملک نے ماں کے نام سے نسبت رکھتا ہوا اس کا نام "خداوندزادہ" رکھا تھا۔ بیٹی کی پیدائش پر مخدومہ جہاں کے ساتھ غازی ملک بھی بہت خوش تھا...... اور جونا خان تو اس ننھی سی گڑیا کو پا کر خوشی سے نہال ہوا اٹھا تھا۔

"چچی جان! آپ کے گھر میں ایسی پیاری سی گڑیا کب آئے گی؟"

ایک شام اس نے معصومیت سے بی بی کدبانو سے سوال کیا تھا۔

"جب اللہ کو منظور ہوگا۔" کدبانو نے شرمیلی نگاہوں سے رجب خان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"ہمیں تو گڑیا نہیں...... تم جیسا پیارا شہزادہ چاہیے۔" رجب خان نے جونا خان کے پھولے ہوئے نرم گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"آپ کو بہرام خان اور محمود خان جیسا منا چاہیے؟" جونا خان نے پُراشتیاق لہجے میں سوال کیا۔ "تو بھلا آپ اس کا کیا نام رکھیں گے......؟"

"نام۔؟" رجب نے سر کھجاتے ہوئے کن انکھیوں سے کدبانو کی طرف دیکھا۔ "نام تو ابھی نہیں سوچا۔"

"پر اپنے ننھے بھائی کا نام میں نے سوچ لیا ہے۔" جونا خان تدبر بھرے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "ہم اس کا نام فیروز خان رکھیں گے...... کیوں چچی جان؟" نام بتا کر جونا خان نے تائید بھری نظروں سے کدبانو کی طرف دیکھا۔

"ہوں۔ نام تو بہت پیارا ہے۔" اس نے شرمیلی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

شاید وہ لفظوں کی تحریر کا وقت تھا کہ جونا خان کے لبوں سے نکلی بات حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اور ٹھیک نو ماہ بعد کدبانو نے ایک صحت مند خوبرو بیٹے کو جنم دیا اور جونا خان کا منتخب کردہ نام "فیروز خان" نومولود کی زندگی کا حصہ بن گیا۔

☆......☆......☆

وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے آٹھ سال بیت گئے۔

جونا خان اب اٹھارہ برس کا گبرو جوان ہو چکا تھا۔

اُس کی ذہانت، تعلیمی قابلیت اور شجاعت کو دیکھتے ہوئے سلطان خلجی نے اسے امیر آخور کے عہدے پر فائز کر دیا تھا۔

فیروز خان کی پیدائش کے بعد سے ہی جونا خان کو اس سے بے حد محبت تھی۔ وہ ہر لحہ اسے اپنے ساتھ رکھنا پسند کرتا تھا۔ جوں جوں وہ بڑا ہوتا ہو گیا، رجب خان کو اس کی تعلیم کی فکر ہوتی گئی مگر اسے طلب علم کا چنداں شوق نہ تھا۔ وہ استاد کے پاس بیٹھ کر سبق یاد کرنے کی بجائے غازی ملک کے چھوٹے لڑکوں کے ساتھ کھیل تماشے میں مشغول رہنا زیادہ پسند کرتا تھا۔

کبھی رجب خان یا کدبانو نے سختی کرنی چاہی تو ہمیشہ ہی جونا خان درمیان میں آ گیا۔ وہ فیروز خان کی آنکھوں میں آنسو برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ ننھا فیروز بھی جونا خان کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا اور ہر لحہ اس کے ساتھ ہی رہتا تھا اور اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے بھائی کا دل بہلاتا رہتا تھا۔

جونا خان امیر آخور کے عہدے پر فائز ہو کر دہلی کے لیے روانہ ہوا تو فیروز خان بھی اس کے ساتھ تھا۔

"جونا خان، تم وہاں اپنی ذمہ داریاں نبھاؤ گے یا...... اس شریر کو سنبھالو گے۔" کدبانو نے اس کا سامان باندھتے ہوئے جواں سال بھتیجے کی طرف دیکھا۔ "میں کہتی ہوں تم اسے ساتھ نہ لے جاؤ، بلاوجہ پریشان ہو گے...... وہاں گھر میں کوئی عورت بھی تو نہیں ہوگی......"

"چچی جان آپ اس بات کی فکر مت کریں۔" جونا خان نے مسکرا کر جواب دیا۔ اتالیقیں، ماما ئیں، خادمائیں بہت ہوں گی...... البتہ وہاں آپ جیسی محبت کرنے والی ماں نہ ہوگی...... آپ چاہیں تو آپ بھی ہمارے ساتھ ہی تشریف لے چلیں۔"

"صاحب زادے یہ تو تم اپنے اتو کے ساتھ زیادتی کرو گے۔" رجب خان مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "بھائی کو تو لے کر جا ہی رہے ہو، اب اپنی چچی جان کو بھی لے گئے...... تو پھر یہاں اکیلے رہ ہم کیا کریں گے......"

رجب خان تم اکیلے کہاں ہو؟" غازی ملک مسکراتا ہوا آگے بڑھا...... "ماشاء اللہ گھر بچوں سے بھرا ہوا ہے...... پھر بھی اگر تم چاہو تو جونا خان کے ساتھ چلے جاؤ...... کیونکہ ہم جانتے ہیں جس طرح جونا خان فیروز کے بغیر نہیں رہ سکتا، اسی طرح تم...... جونا خان کے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

"ابا جان ٹھیک کہہ رہے ہیں اتو جان۔" جونا خان نے چچا کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آج کل آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی...... وہاں دہلی کے کسی بڑے طبیب سے علاج کروائیں گے۔"

"اگر ایسا ہے تو پھر میں بھی ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔" کدبانو نے ہاتھ اٹھا کر کہا اور سب ہی لوگ بے ساختہ ہنس پڑے۔

اور اگلے دن جونا خان اپنے چچا رجب، چچی کدبانو اور عزیز از جان چچازاد بھائی فیروز کے ساتھ دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

دہلی پہنچتے ہی رجب کی طبیعت اچانک ہی زیادہ بگڑ گئی، نئے شہر کا موسم شاید اسے راس نہیں آیا تھا۔ جونا خان نے فوراً ہی شہر کے معروف اور قابل حکیم علی متقی خان کو بلا بھیجا۔ بوڑھا اور دانا حکیم دیر تک رجب خان کی نبض پر ہاتھ دھرے آنکھیں بند کیے، اس کے مرض کو سمجھنے کی کوشش میں لگا رہا۔

"کیا کبھی یہ زخمی ہوئے تھے؟" چند لمحوں بعد اس نے آنکھیں کھول کر قریب کھڑے جونا خان سے سوال کیا۔

"زخمی؟" جونا خان نے چونک کر رجب کی طرف دیکھا تھا۔ "جی...... مگر یہ تو بہت پرانی بات ہے۔ اس واقعے کو کم و بیش آٹھ نو سال بیت چکے ہیں۔" جونا خان نے ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بتایا۔ کدبانو کے حکم پر اس کے نوکروں نے رجب خان کو لاٹھیوں سے بری طرح گھائل کر کے جنگل میں پھینک دیا تھا، جہاں اس کے دوست خواجہ خان اور اقبال مندا سے ڈھونڈتے ہوئے اتفاقاً پہنچ گئے تھے اور اس کے ریزہ ریزہ وجود کو چادر میں سمیٹ کر گھر لے گئے تھے اور مہینوں کے علاج کے بعد کہیں جا کر اس کے زخم بھرے تھے۔

"اوپر کے زخم تو بھر گئے تھے...... پر اندر کا ایک زخم رہ گیا تھا۔" حکیم علی متقی نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ "اور اب برسوں بعد، اندر ہی اندر رستے رستے اُس نے ناسور کی شکل اختیار کرلی ہے۔"

"ناسور؟" جونا خان کے جواں اور رعنا چہرے پر تشویش کے آثار نمودار ہوئے۔ "حکیم صاحب...... اس ناسور کا کوئی علاج تو ہوگا۔"

"گو کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔" حکیم نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "پھر بھی میں علاج کی کوشش کرتا ہوں...... شفاء اس رب کائنات کے ہاتھ میں ہے۔"

ساری رات موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی، جس کے باعث خنکی بڑھ گئی تھی۔

رجب کی طبیعت دو روز سے بہت زیادہ خراب تھی، علی متقی جیسے قابل اور تجربہ کار حکیم کی ساری کوششیں بے سود اور بے معنی ثابت ہو رہی تھیں۔ مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی، کے مصداق رجب کی حالت دن بہ دن خراب ہوتی جارہی تھی۔ کدبانو فیروز خان اور جونا خان رات دن اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری میں لگے رہتے مگر اس کی طبیعت بہتر ہونے کی بجائے اور بگڑتی جارہی تھی۔

"کدبانو! میرے بعد فیروز خان کا خیال رکھنا۔" رجب خان نے نیم وا آنکھوں سے بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے، نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "اور اگر تم چاہو تو...... واپس اپنے ماں باپ کے گھر جاسکتی ہو...... فیروز خان کو جونا خان سنبھال لے گا۔"

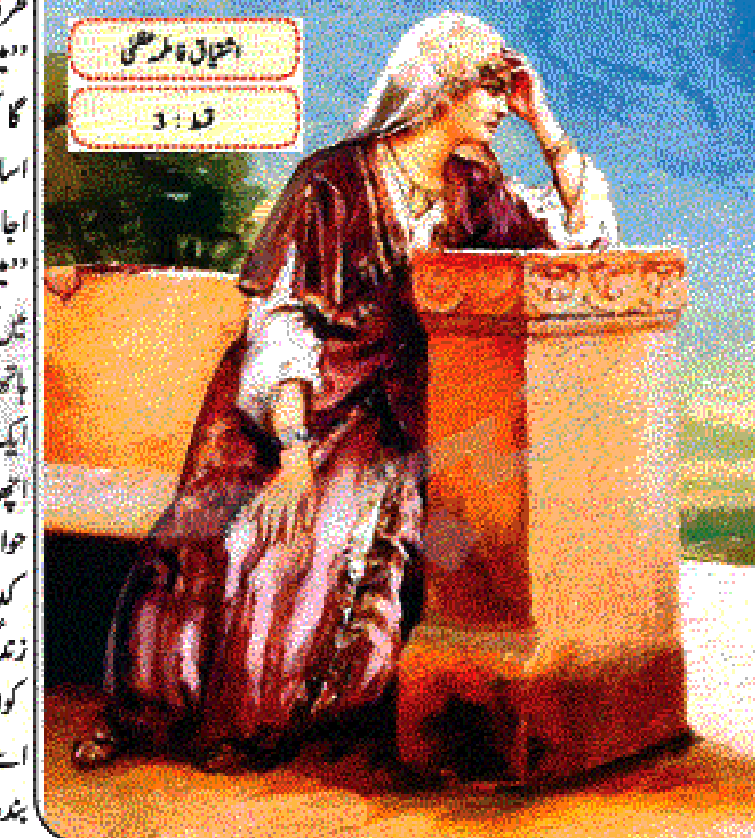
"آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔" کدبانو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "اللہ نے چاہا تو آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"جونا خان۔" رجب نے اپنے نوجوان بھتیجے کو آواز دی۔ "فیروز خان تمہارے حوالے ہے...... اب تم ہی اس کے والی، وارث ہو...... ہمارا وقت سفر آ پہنچا......"

(جاری ہے)

غازی ملک کی اونچی حویلی کے کشادہ ایوان میں، فرش پر سفید چاندیاں بچھی ہوئی تھیں، چاندی کے اگردانوں میں سلگتی اگربتیوں کا مشکبار دھواں فضا میں بکھر کر ایک تقدس آمیز ماحول پیدا کر رہا تھا۔

ساری رات موسلا دھار بارش ہوتی رہی تھی۔ اپنے توڑے گئے ستم پر آسمان خود بھی پشیمان تھا اور شب بھر آنسو بہاتا رہا تھا۔ بادلوں کی گرج میں ماتم کا شور رچا ہوا تھا اور ہواؤں کے جھکڑ بین کرتے محسوس ہو رہے تھے۔ چاند، تارے، سیاہ بادلوں کی دبیز چادر تلے منہ لپیٹے پڑے تھے۔



روشنی سے محروم تاریک رات اپنے سیاہ آنچل میں منہ چھپائے محو گریہ تھی۔ کائنات پر بکھری شب دیجور کے دامن میں غازی ملک کی اونچی حویلی مجسم غم بنی سر جھکائے کھڑی تھی۔

باہر بادل گرج رہے تھے، موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور اندر ہو کا عالم تھا۔ خود غازی ملک سیاہ ماتمی لباس میں پیکر غم بنا مہر بہ لب بیٹھا تھا، اس کی بھیگی پلکیں اور نم آنکھیں اس کے دل میں اٹھتے غم کے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں۔ کل تک دمکتا ہوا صحت مند چہرہ اس وقت اُترا ہوا...... اور وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

ایک حادثہ تھا جو اس کے سر پر ٹوٹا تھا۔

ایک سانحہ تھا جو اس کی دیوارتن میں دراڑیں ڈال گیا تھا۔

ایک المیہ تھا جو اس کے دل پر قیامت ڈھا گیا تھا۔

گزشتہ شب موت کا ظالم پنجہ اس سے اس کا عزیز بھائی چھین کر لے گیا تھا۔

اگلی صبح جونا خان، جوان چچا کی نعش دہلی سے لے کر سوانا پہنچا تھا۔ عصر و مغرب کے درمیان تدفین ہوئی تھی اور تمام شب موسلا دھار بارش کی نذر ہو گئی تھی۔

اب بارش تھم گئی تھی۔

غازی ملک اپنی حویلی کے بڑے ایوان میں سفید چاندنی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کے ساتھ اس کے تینوں بیٹے اور رجب خان کا اکلوتا دس سالہ بیٹا فیروز خان بھی خاموش اور افسردہ بیٹھا تھا۔ رفقاء اور عزیز و اقارب اس کے بھائی کی جواں مرگی پر پرسے کے لئے آ رہے تھے۔ آنے والے کچھ دیر سر جھکا کر خاموش و افسردہ بیٹھتے، مرنے والے کے حق میں دعائے مغفرت کرتے اور غازی ملک کو صبر کی تلقین کر کے رخصت ہو جاتے۔

تب ہی، روپ گڑھ کا مکھیا سیوک رام ایوان کے دروازے پر نمودار ہوا تھا۔ اپنی چیچپاتی گرگابیاں دروازے کی اوٹ کھسکا کر وہ دبے پاؤں غازی ملک کی طرف بڑھا۔ آہٹ پر غازی ملک نے نگاہ اٹھا کر آنے والے کی سمت دیکھا۔

''نمسکار مہاراج۔'' سیوک رام جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بیٹھو سیوک رام۔'' ملک غازی نے سر کی ہلکی سی جنبش سے اس کے ''نمسکار'' کو قبول کرتے ہوئے اسے اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دھنیواد......'' وہ شکریہ ادا کرتا باادب ہو کر بیٹھ گیا۔

''آپ کے بھائی کی موت کا سن کر بہت افسوس ہوا۔'' چند لمحوں کے سکوت کے بعد وہ دھیمی آواز میں گویا ہوا۔ ''کل شام اتنی زوروں کی برسات نہ ہو رہی ہوتی تو میں کریا کرم میں بھی ضرور شامل ہوتا۔''

''سیوک رام، شاید تم بھول رہے ہو، رجب خان صرف میرا بھائی ہی نہیں تمہاری بیٹی کا خاوند...... اور تمہارا جوائی بھی تھا۔''

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔'' غازی ملک کے لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے سیوک رام جلدی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''اسی واسطے تو میں اپنی بیٹی کو لے جانے کے لئے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب......؟'' غازی ملک نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''اب جب رجب خان دنیا میں موجود نہیں ہے...... تو نائلہ کا...... اس گھر میں رہنے کا کیا جواز بنتا ہے...... میں چاہتا ہوں، آپ اسے میرے ساتھ جانے کی آگیا دے دیں۔''

''سیوک رام۔'' غازی ملک نے تیکھے لہجے مگر دھیمی آواز میں کہا۔ ''بے شک اب رجب خان ہم میں نہیں ہے مگر یہ گھر اور اس گھر کے باسی اب بھی کد بانو کے اسی طرح اپنے ہیں، جیسا کہ رجب خان کی موجودگی میں تھے...... لیکن اس کے باوجود اگر وہ خود سے جانا چاہے گی تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔''

غازی ملک کے اشارے پر ایک خادمہ اندر کی جانب چلی گئی اور کچھ ہی دیر بعد اندرونی دروازے کے پردے کے پیچھے بی بی کد بانو آ کھڑی ہوئی تھی۔

''نائلہ! میری بیٹی...... میں تجھے لینے آیا ہوں۔'' سیوک رام نے ملتجی لہجے میں کہا۔

''پتاجی......!'' اندر سے کد بانو کی سسکتی ہوئی آواز ابھری۔ ''اگر آپ میرے خاوند کی جواں مرگی پر پرسے کے لئے آئے ہیں تو کچھ دیر بیٹھیں مگر، اگر اپنی بیٹی نائلہ کو واپس لے جانے کے لئے آئے ہیں، تو براہ کرم فوراً ہی یہاں سے چلے جائیں...... کیونکہ یہاں آپ کی بیٹی نہیں رہتی، یہاں رجب خان کی بیوہ رہتی ہے...... آپ سے میرا اُسی دن رشتہ ٹوٹ گیا تھا جس دن میں نائلہ سے کد بانو بنی تھی اور کد بانو کا اس گھر اور گھر کے لوگوں سے ایسا ناتا ہے جو کبھی نہیں ٹوٹ سکے گا...... آپ سے التجا ہے اب کبھی اس گھر میں نائلہ کا نام لے کر مت آیئے گا...... وہ تو برسوں پہلے مر چکی......''

سیوک رام کے چہرے پر مُردنی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد وہ بنا کچھ کہے کواڑ کے پیچھے سے اپنی گرگابیاں نکال کر پیروں میں اُڑستا تیزی سے باہر چلا گیا۔

جونا خان نے قریب بیٹھے ننھے فیروز خان کو اپنے سینے میں چھپا لیا۔ وہ رجب خان کی زندگی میں بھی فیروز سے بے حد محبت کرتا تھا اور اب تو ایک طرح سے فیروز خان ان سب کی ذمے داری بن گیا تھا۔

رجب خان کے چہلم کے بعد جونا خان نے دہلی کے لئے رخت سفر باندھا۔ وہ اپنے ساتھ ننھے فیروز خان کو بھی لے جانا چاہتا تھا۔

''بابا جان! دہلی میں اعلیٰ درجے کے مدارس اور اساتذہ موجود ہیں، میرا خیال ہے کہ وہاں فیروز خان کی تعلیم کا عمدہ بندوبست ہو سکتا ہے۔''

''مجھے تمہارے خیال سے اتفاق ہے۔'' غازی ملک نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ''مگر یہ مت بھولو کہ تمہاری چچی کد بانو کا واحد سہارا یہی بچہ ہے۔ خاوند سے دائمی جدائی کے بعد کیا وہ اپنے بیٹے سے جدا ہو کر جی سکے گی؟''

''اوہ......'' جونا خان نے پُرتشویش انداز میں ہونٹوں کو جنبش دی۔

''بہتر ہوگا تم پہلے بی بی کد بانو سے اجازت لے لو...... اگر وہ منع کرے تو تمہیں فیروز خان کو ساتھ لے جانے پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔''

''جی بہتر۔'' باپ کے مشورے پر جونا خان نے سر جھکاتے ہوئے سعادت مند لہجے میں جواب دیا اور آہستگی سے صحن کی طرف روانہ ہو گیا جہاں کد بانو، اس کی ماں مخدومہ جہاں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔

''جونا خان، کیا جانے کی تیاری مکمل ہو گئی؟'' مخدومہ جہاں نے بیٹے سے سوال کیا۔

''جی امی جان۔'' اس نے ماں کو جواب دے کر ہچکچاتی نظروں سے چچی کی طرف دیکھا۔

''مجھے چچی جان سے ایک بات کرنا تھی۔''

''کہو جونا خان، کیا بات ہے؟'' بی بی کد بانو فوراً بھتیجے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''میں نے سوچا تھا کہ فیروز خان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا کیونکہ وہاں دہلی میں اعلیٰ درجے کے مدارس اور اساتذہ ہیں لیکن بابا جان کا حکم ہے، پہلے میں آپ سے اجازت لوں۔''

''میں جانتی ہوں جونا خان۔'' بی بی کد بانو نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''مرتے وقت انہوں نے فیروز کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ایک مجبور ماں کی نسبت ایک قابل بھائی اپنے یتیم چچازاد بھائی کے لئے زیادہ اچھا ثابت ہوگا...... اسی لئے انہوں نے فیروز کو میرے حوالے نہیں، تمہارے حوالے کیا تھا۔''

کد بانو دم بھر کو دم لینے کو رکی، پھر بولی۔ ''جو کام وہ اپنی زندگی میں کر گئے، اس کام میں رخنہ ڈالنے والی میں کون......؟ فیروز خان تمہارے حوالے ہے...... تم چاہو تو اسے ساتھ لے جاؤ اور جیسا چاہو اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرو...... آج کے بعد سے تمہیں کبھی مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔''

''شکریہ چچی جان۔'' جونا خان تشکر بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس اعتماد کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، کوشش کروں گا کہ آپ کے اس اعتبار کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔''

اسی شام جونا خان، فیروز کو ساتھ لے کر دہلی کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

رجب خان کی جواں مرگی کا جونا خان کے دل پر سخت اثر ہوا تھا۔ تمام تر علاج و معالجے کے باوجود رجب جانبر نہ ہو سکا تھا۔ اس حادثے نے اسے علم طب کی طرف راغب کیا تھا۔ اب وہ فرصت کے اوقات میں اکثر طب کی کتابوں کا مطالعہ کرتا اور شہر کے نامچین حکماء اور اطباء سے ملاقاتیں کر کے مختلف امراض کے حوالے سے گفت و شنید کرتا اور اس کے اس شوق اور لگن کا نتیجہ جلد ہی سامنے آ گیا۔ اسے علم طب پر اچھی خاصی دسترس حاصل ہو گئی تھی، وہ روشن دماغ تھا، اس کا حافظہ بلا کا تھا، اس میں حصول علم کی بے پناہ استعداد تھی اور وہ پہلے سے ہی متعدد علوم کا ماہر تھا۔ مثلاً منطق، فلسفہ، ریاضی، علم نجوم، قدرتی سائنس اور شعر و سخن پر اسے عبور حاصل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ پایہ کا خوش نویس بھی تھا اور اب اسے علم طب پر بھی دسترس حاصل ہو گئی تھی...... اتنی کہ بڑے بڑے مشاق اور زیرک اطباء اس سے پیچیدہ امراض کے سلسلے میں صلاح و مشورہ کرنے لگے تھے۔ خود سلطان خلجی اس کی اس خوبی کا متعارف تھا۔

☆......☆......☆

شام کے سرمئی سائے دلی کے کوچہ و بازار پر پھیلتے جا رہے تھے۔ قصر شاہی کے پہلو میں آباد شاہی محلے میں واقع سلطان خلجی کے دست راست امیر نصرت خان کی شاندار حویلی کے اونچے برج سورج کی رخصت ہوتی نارنجی کرنوں میں چمک رہے تھے۔ حویلی کے احاطے میں پھیلے وسیع و کشادہ باغیچے شام کی ٹھنڈی اور پُرتسکین ہواؤں میں جھوم رہے تھے۔

حویلی کے اندرونی حصے میں زنان خانے سے ملحقہ باغیچے میں مہندی کی باڑھ پر اس وقت شگوفے کھلے ہوئے تھے اور شام کی نرم ہوا میں مہندی کے ان نوشگفتہ شگوفوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔

امیر نصرت خان کی اکلوتی بیٹی زرنگار بانو بیگم اس وقت مہندی کی اسی باڑھ کے قریب لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھی گہری سوچوں میں گم تھی جبکہ اس کی بوڑھی انا خجستہ خانم مہندی کے پتے توڑنے میں مصروف تھی۔

زرنگار بانو کو حسن فطرت سے بے حد پیار تھا۔ ہوا کے نرم جھونکوں سے جھومتے تناور درخت، درختوں کی لچکتی شاخوں پر چہچہاتے پرندے اور فضا میں بسی تیز پھولوں کی جان فزا مہک اُسے بے حد پسند تھی۔ اسی لئے ڈھلتی شام میں وہ اکثر حویلی کے اس سرسبز و شاداب باغیچے میں سیر کے لئے آ جاتی تھی اور وہ جب تک چہل قدمی کرتی، اس کی بوڑھی انا خجستہ خانم اس کے لئے مہندی کی پتیاں چن لیتی تھی کیونکہ زرنگار بانو کو مہندی بے حد بھاتی تھی۔ اس کے نازک ہاتھ اور گورے دلکش پیر ہمیشہ مہندی سے رچے رہتے تھے۔ ہتھیلیوں سے اٹھتی حنائی مدھر خوشبو اس کی روح میں ایک عجب سا انوکھا اَن چھوا احساس جگا دیتی تھی۔

اُسے شعر و ادب سے لگاؤ تھا۔ قابل اساتذہ کی تربیت نے اس کے اندر ایک لطافت، دلکشی اور رعنائی بھر دی تھی۔ اسے فارسی اور ترکی زبان پر عبور حاصل تھا۔ فارسی اور ترک زبان کے اعلیٰ پایہ کے شعراء کا کلام اسے زبانی یاد تھا۔ وہ فطرت سے پیار کرنے والی اور سندر سپنے دیکھنے والی ایک نازک اندام اور دلکش لڑکی تھی۔

اس سال ماہ شوال میں وہ پورے سولہ برس کی ہونے والی تھی اور اس کے باپ امیر نصرت خان کی خواہش اور کوشش تھی کہ اس کے سولہ برس مکمل ہونے سے پہلے پہلے اُسے پیا کے دیس رخصت کر دے اور اس سلسلے میں اس نے اپنے چچیرے بھائی اظفر خان کے بیٹے مراد خان کا رشتہ بھی قبول کر لیا تھا۔ مراد خان کی چھوٹی بہن شاداب بانو، زرنگار بانو کی ہم سن تھی اور دونوں میں گہری دوستی تھی۔ شاداب بانو نے ہی اسے یہ خبر دی تھی۔

''کچھ خبر بھی ہے، ہمارے گھر میں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟'' اس نے زرنگار کو گدگداتے ہوئے پوچھا۔

''تم کچھ بتاؤ گی تو پتہ چلے گا نا......! مجھ بے چاری کو کیا خبر؟'' زرنگار نے معصومیت سے جواب دیا۔

''بابا جان نے مراد بھائی کے لئے تمہارے بابا جان سے بات کی ہے۔''

شاداب کی بات سنتے ہی چونک کر زرنگار نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''بھئی مطلب صاف ہے...... میرے بابا جان، مراد خان بھائی سے تمہاری شادی کے خواہشمند ہیں، اسی لئے انہوں نے تمہارے بابا یعنی نصرت انو جان کے پاس پیام بھجوایا تھا۔'' شاداب نے مزے لے لے کر پوری بات بتائی۔

''اور...... بابا جان نے کیا جواب دیا؟'' زرنگار کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا، ایک جا رہا تھا۔

''انہوں نے جواب دیا کہ تم سے مشورہ کر کے اور سوچ کر جواب دیں گے مگر قرین قیاس یہی ہے کہ انہیں یہ رشتہ پسند آیا ہے اور وہ جلد ہی ہامی بھر لیں گے۔''

اور ہوا بھی یہی۔ جلد ہی نصرت خان نے مراد خان کا رشتہ قبول کر لیا۔

مگر جس دن سے یہ رشتہ طے ہوا تھا، زرنگار بانو کے دل کا عجب عالم تھا۔ وہ شاداب کے توسط سے مراد خان کے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھی۔

اسے علم حاصل کرنے کا کبھی شوق نہیں رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ باپ کی بے حد خواہش اور کوشش کے باوجود وہ نرا جاہل ہی رہا تھا۔ دلی کے نوابین میں جو خاندانی اور فطری نقائص تھے، وہ سب بدرجہ اتم اس میں پائے جاتے تھے۔ وہ جوئے کا رسیا، شراب اور افیون کا عادی اور کبوتر بازی کا شوقین تھا۔

''شاداب! تم اپنے بھائی کو بھی جانتی ہو اور بچپن سے میری بھی رازدار سہیلی رہی ہو، اپنے ایمان سے کہنا...... کیا میرا اور مراد خان کا کوئی جوڑ بنتا ہے؟''

''اگر سچ پوچھو تو......'' شاداب بانو نے دھیمے مگر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''میرا بھائی تم جیسی نفیس اور حسین سوچ رکھنے والی تعلیم یافتہ اور قابل لڑکی کے قابل نہیں ہے...... تم جیسی مایہ ناز لڑکی سے شادی ہونے کے بعد بھی وہ اپنی روش نہیں چھوڑے گا، اس کی راتیں گانے والیوں کے کوٹھوں پر گزریں گی...... اور تم...... دروازے پر آنکھیں بچھائے اس کی راہ دیکھتی رہو گی۔''

''مجھے ایسی زندگی جینا پڑی تو میں دو روز میں مر جاؤں گی۔'' زرنگار بانو نے سسکتے لہجے میں کہا تھا۔ ''میں حویلی کے زنان خانوں میں مقید دوسری بیگمات کی طرح سونے، چاندی اور ہیرے جواہرات کے گہنے اور اطلس و کمخواب کے ملبوسات سے آراستہ ہو کر باہر کے مشاغل میں مبتلا اپنے خاوند کی راہ تکتے...... جیون نہیں بتا سکتی...... میں قفس میں قید کسی پرندے کی طرح تڑپ تڑپ کر جان دے دوں گی۔'' زرنگار بانو کی ریشمیں پلکیں بھیگ گئی تھیں۔

''زری، میری سکھی، میری بہن......'' شاداب بانو نے بے ساختہ اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔ ''میرے بھائی کی دلہن بن کر تم میرے گھر آتیں، یہ بات میرے لئے بے حد خوشی کا باعث ہوتی مگر اس وقت جب میرا بھائی تمہارے قابل ہوتا...... ایسی صورت میں، میں بھی یہ نہیں چاہوں گی کہ...... تمہارے ساتھ یہ ظلم ہو۔''

''شاہی...... میری بہن۔'' زرنگار بے ساختہ شاداب سے لپٹ گئی تھی۔

اب سوال یہ تھا کہ اس مشکل سے کیونکر نجات حاصل کی جائے اور وہ بھی اس طرح کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ زرنگار کی آرزو تھی کہ اس کے منع کرنے کی بجائے خود مراد خان کی طرف سے ہی انکار ہو جائے تاکہ اس پر کوئی الزام نہ آئے مگر سوال یہ تھا کہ ایسا ہو تو کیونکر...... وہ دونوں کافی دیر تک سر جوڑ کر صلاح مشورے کرتی رہیں مگر کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی تھیں۔

''کیا بات ہے ننھی بیگم...... کچھ پریشان دکھائی دے رہی ہو؟'' اس کی انا خجستہ بانو نے اسے پریشان اور الجھن کا شکار دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔ خجستہ بانو نے اسے ماں بن کر پالا تھا، اسی کا دودھ پی کر زرنگار بڑی ہوئی تھی، اسے وہ اپنی بیٹی سے بڑھ کر عزیز تھی۔

''کیا بتائیں انا بی......!'' زرنگار نے افسردہ لہجے میں جواب دیا۔ ''ابھی بابا جان نے تو ہم سے ایسی کوئی بات نہیں کی ہے...... مگر شاداب سے ہمیں پتہ چلا ہے کہ......'' پھر زرنگار نے سارا قصہ اس کے گوش گزار کر دیا۔

''ننھی بیگم، یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔'' انا خجستہ بھی ایک دم پریشان ہو اٹھی تھی۔ وہ مراد خان کی فطرت اور خصلت سے خوب واقف تھی۔

''اب آپ ہی بتایئے، کیا کیا جائے؟'' زرنگار بانو نے دلگیر لہجے میں سوال کیا اور فوری طور پر خجستہ خانم کوئی جواب نہ دے سکی۔

☆......☆......☆

''ننھی بیگم، کل سے اپنے کمرے میں پڑی ہو، آؤ ذرا پائیں باغ کی سیر کر آئیں۔'' انا خجستہ نے اسے دل گرفتہ اپنے کمرے میں پڑے دیکھ کر ترغیب دلانے والے لہجے میں کہا۔ ''مہندی بھی ختم ہو گئی ہے، تم چہل قدمی کر لینا، میں مہندی چن لوں گی۔''

''آپ کہتی ہیں تو چلی جاتی ہوں ورنہ دل تو کچھ کرنے کو نہیں چاہتا۔'' زرنگار بانو اٹھ کھڑی ہوئی۔

اور اس وقت وہ ٹہلنے کی بجائے لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھی اپنی ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔ کل سے اب تک شاداب بھی نہیں آئی تھی کہ اس سے گھڑی دو گھڑی بات کر کے دل کا بوجھ کم کر لیتی۔

علم نے اسے شعور اور ذہانت عطا کی تھی۔ ہوش سنبھالتے ہی اس کے ذہن رسا میں جیون ساتھی کا ایک تصور جا گزیں ہو گیا تھا۔ ایک ذہین، اعلیٰ تعلیم یافتہ، فہم و ذکا میں سب سے اوّل، قابلیت و اہلیت میں جس کا کوئی ثانی نہ ہو، اپنے ہم عصروں میں وہ سب سے آگے ہو۔

''زری! ایسا عالم و فاضل، زیرک اور دانا انسان اس دھرتی پر تو شاید موجود نہیں ہو؟'' شاداب نے اس کی ساری باتیں سن کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ایسا گنوں کا پورا بھلا کوئی شخص کہاں ہوگا؟''

''میرا دل کہتا ہے، وہ اسی سرزمین پر موجود ہے اور جلد یا بدیر مجھ سے آ ملے گا۔'' زرنگار نے پورے یقین سے جواب دیا تھا۔

''اور اگر ایسا نہ ہو سکا تو......؟'' شاداب کا سوال تھا۔

''تو...... میں زندگی کے آخری لمحوں تک اس کا انتظار کروں گی۔'' زرنگار نے پورے وثوق سے جواب دیا اور شاداب اس کا دلکش چہرہ دیکھتی رہ گئی تھی۔

تب ہی آہٹ پر زرنگار نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ سامنے سے شاداب مسکراتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

''کل کے بعد اب صورت دکھائی ہے۔'' اسے دیکھتے ہی زرنگار نے شکوہ داغ دیا۔ ''یہ جاننے کی بھی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہم جیتے ہیں یا مر گئے۔''

''مریں تمہارے دشمن۔'' شاداب مسکرائی۔ ''کل سے گھر میں بیٹھے ہم تمہارے مسئلے کا حل تلاش کرنے میں لگے تھے...... اور آخرکار......''

''آخرکار کیا؟'' زرنگار نے بے صبری سے پوچھا۔

''آخرکار ہم ایک حل تلاش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔'' وہ فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔

''سچ......'' زرنگار نے بے یقین لہجے میں سوال کیا۔

''سچ، ایسی ترکیب سوچی ہے...... کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''للّٰہ، جلدی بتاؤ۔'' زرنگار کی بے تابی میں اضافہ ہو گیا۔

''ابھی نہیں۔'' شاداب شوخ انداز میں مسکرائی۔ ''پہلے اندر چلو، مابدولت کی خاطر مدارات کا بندوبست کرو...... اس کے بعد آرام سے ہم ساری کتھا سنائیں گے۔''

پھر ناشتے سے فارغ ہو کر شاداب نے بات کا آغاز کیا۔

''تم فوری طور پر بیمار پڑ جاؤ۔''

''وہ کیسے......؟'' زرنگار حیران ہوئی۔

''خود ساختہ بیماری خود پر لاد لو اور بستر سے لگ جاؤ، کمزور و لاغر دکھائی پڑنے کیلئے ایک آدھ وقت کا کھانا چھوڑنا پڑے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ انا بی طبیبوں کو اور میں اپنے گھر میں، خاص طور پر مراد بھائی کو تمہاری بیماری کا احوال بڑھا چڑھا کر بتاتی رہوں گی...... اس وقت تک جب وہ عاجز ہو کر خود ہی اس روگی، مریضہ سے شادی سے انکار نہ کر دیں۔''

''ترکیب تو اچھی ہے۔'' زرنگار نے پُرسوچ نظروں سے شاداب کی طرف دیکھا۔ ''مگر بھلا طبیبوں کو کس طرح بے وقوف بنایا جائے گا؟''

''تم ان کے سامنے تو نہیں آؤ گی، تمہارا حال بیان کر کے انا بی ہی دوا دارو لائیں گی اور وہی سب کچھ بتائیں گی جو انہیں کہا جائے گا...... اور رہا سوال دواؤں کا...... وہ تمہیں کھانی ہی نہیں ہیں...... سمجھیں......''

''سمجھ گئی۔'' زرنگار کے خشک لبوں پر پہلی بار تر و تازہ مسکراہٹ بکھری۔

☆......☆......☆

بیٹی کی بیماری پر شروع شروع میں تو نصرت خان نے کوئی خاص توجہ نہ دی مگر جوں جوں بیماری طول کھینچتی گئی، وہ متفکر ہو گیا۔ زرنگار اس کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی اور جلد ہی وہ اس کی شادی کا ارادہ رکھتا تھا مگر وہ بستر سے لگ گئی تھی۔ ایسی صورت میں شادی کا کیا سوال اٹھتا تھا۔

"تم کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہو نصرت خان؟" اس شام وہ سلطان کی محفل شعر و ادب میں حاضر تھا مگر اس کے اندر کی فکرمندی چہرے سے عیاں تھی۔ یہ بات محسوس کرتے ہوئے سلطان نے مشفقانہ لہجے میں سوال کیا۔

اور اس نے سر جھکا کر بیٹی کی بیماری کا احوال بیان کر دیا۔

"شہر کے تمام قابل اور زیرک اطباء کو دکھا لیا..... مگر مرض بڑھتا رہا جوں جوں دوا کی، کے مصداق اس کی بیماری ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی





ہے۔"

"ایک بار تم اسے امیر اخور جونا خان کو بھی دکھا لو۔" سلطان نے ساری بات سن کر تدبر بھرے لہجے میں مشورہ دیا۔ "اسے علم طب میں بہت مہارت حاصل ہو گئی ہے۔"

"جیسا آپ کا حکم سلطان معظم۔" نصرت خان نے کورنش بجالاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں خود بھی جونا خان کو خبر کروا دوں گا۔" سلطان نے کمال شفقت سے جواب دیا۔

"نوازش ہے، سلطان معظم۔" نصرت خان نے دوبارہ آداب پیش کیا۔

اور شام ڈھلتے ہی سلطان کا خادم خاص جونا خان کے پاس اس کا پیغام لے کر حاضر ہو گیا۔

"امیر نصرت خان کی صاحبزادی کی طبیعت ناساز ہے..... سلطان معظم کی خواہش ہے کہ آپ کل صبح جا کر مریضہ کا حال دیکھ کر علاج تجویز فرما دیں۔"

"بہتر ہے۔" جونا خان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اور اگلی صبح وہ نصرت خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ فیروز خان بھی تھا۔ وہ فیروز خان کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔

کل رات جب خجستہ، امیر نصرت خان کے سامنے خوان لگا رہی تھی، تب بالکل اچانک ہی نصرت خان نے اس سے سوال کیا تھا۔

"خجستہ بی، اب زرنگار کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بس کیا بتاؤں سرکار۔" خجستہ نے سوکھا سا منہ بنا کر رٹا رٹایا جملہ ادا کیا۔ "ننھی بیگم کی حالت تو خستہ سے خستہ تر ہوتی جا رہی ہے۔" لحظہ بھر کو تھم کر اس نے نصرت خان کی طرف دیکھا۔ اس کے جملے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا اور نصرت خان کی آنکھوں سے جھانکتی فکرمندی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں، یہ جو کوچہ دلبراں سے حکیم صاحب آ رہے ہیں، انہیں تو آپ منع ہی کر دیجئے، ان کے علاج سے جو رتی بھر افاقہ ہوا ہو؟"

"ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں۔" نصرت خان نے رکابی سے ہاتھ کھینچتے ہوئے جواب دیا۔

"اللہ ماری اتنی بڑی دلّی میں کوئی ایسا طبیب، حکیم نہیں جو ہماری ننھی بیگم کے مرض کی تشخیص کر سکے اور ان کا علاج کر سکے؟" خجستہ نے دہائی دینے والے انداز میں کہا اور آفتابہ لے کر نصرت خان کا ہاتھ دھلانے آگے بڑھی۔

"نہیں ایسا نہیں ہے۔" نصرت خان نے ہاتھ آگے کئے۔ "کل سلطان معظم کو میرے چہرے سے کچھ اندازہ ہوا ہو گا، تب ہی انہوں نے پریشانی کا سبب پوچھا اور میرے بتلانے پر کمال شفقت سے ایک طبیب کا نہ صرف نام تجویز کیا بلکہ ازراہ مہربانی اسے صبح یہاں حاضر ہونے کا پیغام بھی بھجوا دیا۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے۔" خجستہ نے ہاتھ پونچھنے کے لئے انگوچھا آگے بڑھایا اور بولی۔ "بھلا کون طبیب ہیں؟"

"ملک جونا خان....." نصرت خان نے تھوڑا سا سر اونچا کر کے قدرے فخریہ لہجے میں کہا۔ "سلطان معظم ان کی لیاقت کے معترف ہیں، اپنے دکھ تکلیف میں پہلے انہیں ہی طلب کرتے ہیں..... بہت قابل طبیب ہیں۔"

"اچھا۔" خجستہ کے پیٹ میں کھد بد ہونے لگی۔ وہ اشارے سے خادماؤں کو دسترخوان بڑھانے کا کہتی تیزی سے زنان خانے کی طرف لپکی۔

شام سے شاداب بانو آئی ہوئی تھی۔ زرنگار نے اسے رات کے کھانے پر روک لیا تھا۔ اس وقت وہ دونوں کمرے میں بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف تھیں تو خجستہ بولائی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"کچھ سنا تم نے ننھی بیگم..... کل تمہیں دیکھنے شاہی طبیب ملک جونا خان تشریف لا رہے ہیں۔؟"

اس کی گھبرائی ہوئی کیفیت پر حیران ہوتے ہوئے شاداب بانو نے جواب دیا۔ "تو اس میں اتنا گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

"ارے، سرکار ابھی بتا رہے تھے وہ بہت دانا طبیب ہیں..... سن رسیدہ زمانے کے سرد و گرم چشیدہ..... بتاؤ انہوں نے اصل مرض بھانپ لیا تو.....؟" خجستہ نے اصل پریشانی کی نشان دہی کی۔

"لو، بھلا ایسا کس طرح ممکن ہے..... اس سے پہلے بھی تو کتنے ہی سن رسیدہ، گھاگ اور مشاق اطباء آ چکے ہیں، کوئی کچھ بھانپ سکا؟ سب اپنی عقل پر ماتم کرتے واپس ہو گئے۔"

"پھر بھی شاداب بٹیا، ہمیں ڈر لگ رہا ہے، تم تو ابھی چلی جاؤ گی..... صبح دم ہم کو ان کا سامنا کرنا ہو گا۔" خجستہ نے خائف نظروں سے شاداب بانو کی طرف دیکھا۔

"اگر یہ بات ہے، تو لو ہم نہیں جاتے۔" شاداب بانو نے دونوں ہاتھ پھیلا کر شاہانہ انداز میں فیصلہ سنایا۔

"سچی تم نے تو میرے منہ کی بات کہہ دی۔" زرنگار خوش ہو کر بولی۔ "تم رہو گی تو اتابی کے علاوہ میرا بھی حوصلہ بنا رہے گا۔"

"ٹھیک ہے تو اتابی! آپ کسی سے ہماری حویلی پر کہلوا دیجئے کہ آج رات ما بدولت زرنگار کے ساتھ رکیں گے..... ہمیں بلوانے کو پالکی نہ بھیجی جائے۔"

"ابھی لو۔" خجستہ مستعدی سے مسرور لہجے میں بولی۔ "ہم ابھی سراج کو بھیج کر کہلوائے دیتے ہیں۔"

اور اگلی صبح سورج کے زردی پکڑتے ہی ملک جونا خان کی سواری حویلی کے بڑے دروازے سے آ لگی۔ خدام انہیں بگھی سے اتار کر بصد احترام اندر لے آئے۔

اندرونی ڈیوڑھی پر خود نواب نصرت خان بہ نفس نفیس ملک جونا خان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔

"آداب نواب صاحب۔" جونا خان نے قدرے جھک کر شائستہ لہجے میں آداب پیش کیا۔

"تسلیمات۔" نواب نصرت خان نے جواب دیا۔ "اندر تشریف لے چلئے۔" یہ کہہ کر وہ جونا خان اور ننھے فیروز کو ساتھ لئے نشست گاہ کی طرف بڑھ گیا۔

وہ نام کی حد تک تو پہلے سے ہی جونا خان کو جانتا تھا۔ ملک غازی، سلطان خلجی کے قابل اور پسندیدہ اہلکاروں میں سے تھا اور جونا خان اسی ملک غازی (غیاث الدین) کا چہیتا بیٹا تھا۔ شاہی تقریبات میں نصرت خان کا بارہا جونا خان سے آمنا سامنا بھی ہوا تھا، پر اتنے قریب سے ملنے کا آج پہلا اتفاق تھا جبکہ ملک غازی سے وہ اچھی طرح آشنا تھا۔

"زحمت کے لئے میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔" نشست گاہ میں داخل ہونے کے بعد ایک مخملیں نشست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، نصرت خان نے قدرے شرمسار لہجے میں کہا۔

"بھلا اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔" جونا خان نے حسب عادت شائستہ لہجے میں جواب دیا۔ "گو کہ یہ میرا پیشہ نہیں ہے مگر خلق خدا کے استفادے کے لئے ہی میں نے یہ علم حاصل کیا ہے۔"

"سلطان معظم، آپ کی تعریف کر رہے تھے۔" نصرت خان نے نوجوان جونا خان کی طرف دیکھتے ہوئے رشک بھرے لہجے میں کہا۔

"ان کی ذرہ نوازی ہے۔" جونا خان نے انکساری سے ہاتھ ماتھے کی سمت لے جاتے ہوئے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

نصرت خان، تحسین و رشک بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی طالع بخت کی علامت تھی، بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں سے ذہانت اور دلکش کتابی چہرے سے متانت مترشح تھی، وہ ایک باوقار، شاندار سنجیدہ اور مدبر جوان دکھائی دیتا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد دو خادمائیں مشروبات اور دیگر لوازمات سے بھری سینیاں لئے آ حاضر ہوئی تھیں۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں..... مریضہ کو....." چند لمحوں بعد جونا خان نے اجازت طلب نظروں سے نصرت خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں۔" نصرت خان نے دروازے پر ایستادہ خادم کو مخاطب کر کے کہا۔ "سراج، ذرا خجستہ بی کو بلاؤ۔"

اور اگلے ہی لمحے خجستہ بی لپک جھپک کمرے میں داخل ہوئی اور جونا خان پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر اپنی جگہ رک گئی۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی اتنی کے پیٹے کا بوڑھا، بالشت بھر لمبی، سفید جھاگ سی داڑھی والا، تجربہ کار طبیب ہو گا..... مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ سامنے ایک خوبرو اور باوقار نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پہلو میں اس کے نقوش سے مشابہت رکھتا ایک آٹھ نو برس کا بچہ تھا۔

"یہ جناب جونا خان ہیں۔" نصرت خان نے بصد احترام اس کا تعارف کروایا۔ "انہیں ذرا اندر لے جاؤ۔"

"جی بہتر سرکار۔" خجستہ بی نے زور زور سے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور جونا خان کو مخاطب ہو کر بولی۔ "تشریف لائیے سرکار۔"

جونا خان کو ساتھ لئے وہ زنان خانے کی طرف چل دی۔ جونا خان کے اشارے پر فیروز وہیں نشست گاہ میں بیٹھا رہا۔

زنان خانے کی ڈیوڑھی میں واقع گول کمرے سے ملحق کمرے میں زرنگار اور شاداب موجود تھیں، درمیان میں ایک دبیز پردہ چھت تا فرش حائل تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی خجستہ بی نے جونا خان کے لئے پردے کے قریب ہی ایک نشست رکھ دی تھی۔

"تشریف رکھئے سرکار۔ آپ کہیے تو میں مریضہ کا حال بیان کروں۔" جونا خان کے بیٹھتے ہی خجستہ جلدی سے بولی۔

"نہیں، حال بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔" جونا خان نے جواب دیا۔ "میں نبض دیکھ کر خود ہی اندازہ کرنا چاہتا ہوں۔"

"جی بہتر۔" خجستہ سر تسلیم خم کر کے ڈوری لے کر تیزی سے پردے کے اُس پار چلی گئی۔ زرنگار بانو کی کلائی سے ڈوری باندھ کر اس نے اس کا دوسرا سرا جونا خان کے ہاتھ میں لا تھمایا۔

جونا خان نے ڈوری ہاتھ میں تھام کر، آنکھیں بند کر کے تفکر شروع کر دیا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ ڈوری کو ٹٹولتا اور گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ پھر وہ خجستہ بی کو مخاطب کر کے بولا۔ "کلائی پر ڈوری کو ذرا اور کس دیجئے۔"

"جی بہتر۔" خجستہ خانم تیر کی تیزی سے پردے کے اس جانب لپکی۔

کئی لمحوں کے سکوت کے بعد جونا خان نے ڈوری ہاتھ سے چھوڑ دی اور خاموشی سے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"سرکار، اگر آپ اجازت دیں تو میں حال بیان کروں۔" اُسے تذبذب میں دیکھ کر خجستہ بی نے آگے بڑھ کر پھر پیشکش کی۔

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔" جونا خان نے گہری سانس لی۔ "مجھے مرض کا اندازہ ہو گیا ہے۔"

"خدانخواستہ کیا مرض ہے؟" خجستہ نے پریشان لہجے میں پوچھا۔

"حیرت تو یہی ہے کہ کوئی مرض نہیں ہے۔" جونا خان کی پُرسوچ آواز ابھری اور پردے کے اس پار موجود زرنگار اور شاداب نے حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"لل..... لیکن..... یہ کیسے ممکن ہے سرکار..... ننھی بیگم دن بدن لاغر ہوئی جاتی ہیں۔" خجستہ بی نے سٹپٹا کر تاویل پیش کی۔

"انہیں کہئے کہ اپنی غذا پر توجہ دیں۔" جونا خان کرسی سے اٹھتا ہوا بولا۔ "کم خوراکی اور بے توجہی کے باعث کچھ کمزوری ہے..... میں کچھ مقوی ادویات لکھ دوں گا جس کے استعمال سے چند دنوں میں ہی چاق و چوبند ہو جائیں گی..... یہ بات میں ابھی نواب صاحب کو سمجھائے دیتا ہوں، وہ ناحق متوحش و متفکر ہیں۔"

جونا خان کے اختتامی جملے سن کر زرنگار اور شاداب کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے تھے۔

شاداب گھبرا کر پردے کے قریب پہنچی۔ "اتابی! ذرا حضرت طبیب کو روکئے تو....." اس نے اندر سے خجستہ بی کو مخاطب کر کے کہا اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتا جونا خان اپنی جگہ ٹھہر گیا۔

"میں حضرت کو بتانا چاہتی ہوں کہ ان سے قبل بڑے بڑے نامی گرامی اور جید اطباء تشریف لا چکے ہیں، سب ہی نے مختلف امراض کا نام لیا..... بھلا حضرت اتنے یقین سے کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ ان کی تشخیص درست ہے۔"

شاداب بانو کے چبھتے ہوئے لہجے پر جونا خان نے لحظہ بھر کو پلٹ کر پردے کی طرف دیکھا۔ "خاکسار کی تشخیص کس حد تک درست ہے، اس کا اندازہ آپ لوگ بخوبی کر سکتے ہیں، البتہ کچھ کمزوری ہے..... کچھ مقوی ادویات سے وہ جاتی رہے گی..... رہا سوال دیگر اطباء کی تشخیص کا تو غالباً انہوں نے..... پہلے مریضہ کا احوال سنا ہو گا۔"

"بڈھا تو بہت گھاگ ہے۔" شاداب نے کسمسا کر زرنگار کے کان میں سرگوشی کی۔

"آواز سے تو بڈھا نہیں لگتا۔" زرنگار نے اپنی رائے کا اظہار کیا اور شاداب کو ایک جانب کرتی خود پردے سے آ لگی۔

"حضرت، آپ سے ایک گزارش ہے۔" اس نے پردے کی جھری پر آنکھیں رکھتے ہوئے التماس بھرے لہجے میں کہا۔ "ابھی آپ بابا جان سے اپنی تشخیص کا تذکرہ نہ کیجئے گا..... مجھے دو چار دن اپنی ادویات استعمال کر لینے دیجئے۔"

اس تصور سے ہی ان دونوں کا دم نکلا جاتا تھا کہ نصرت خان کو حقیقت حال کا علم ہو گا..... تو ان دونوں کو کس قدر ذلت اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا اور مہینوں کی محنت الگ اکارت جائے گی۔

اس کی ملتجی آواز پر جونا خان نے حیران نظروں سے پلٹ کر دیکھا۔

پردے کی جھری سے جھانکتی زرنگار اپنی جگہ حیرت زدہ رہ گئی۔ اتنا لائق، دانا اور قابل طبیب ایک اٹھارہ انیس برس کا نوجوان بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بات تو اس نے سوچی بھی نہ تھی۔ سفید امامے اور سفید کرتے میں اس کا سرخ و صندلی رنگ بہت نمایاں تھا، اس کی شخصیت میں ایک وقار اور متانت تھی، وہ ہر لحاظ سے ایک شاندار نوجوان تھا۔

جونا خان مریضہ کی گزارش کا مطلب نہیں سمجھ سکا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

"اٹھارہ انیس برس کی عمر میں یہ لیاقت، یہ قابلیت حیرت انگیز ہے۔"

جونا خان کے جانے کے بعد وہ تینوں حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہی تھیں۔

"پر ہیں شادی شدہ..... ان کا آٹھ نو برس کا بیٹا ساتھ آیا تھا۔" خجستہ بی نے اپنی معلومات کا خزانہ لٹایا۔

"اتابی سٹھیا گئی ہو کیا؟" شاداب بانو تنک کر بولی۔ "خود اٹھارہ برس کے ہیں، آٹھ نو برس کا بیٹا ہوا، تو کیا دس برس کی عمر میں باپ بن گئے تھے؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" خجستہ بی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

"یہ سب باتیں چھوڑو اور اس کے پیچھے لپکو، دیکھو وہ اموجان سے کیا کہتا ہے۔" شاداب نے عجلت میں ہاتھ ہلاتے ہوئے خجستہ بی کو اس کے پیچھے جانے کا اشارہ کیا اور وہ لپکتی ہوئی باہر چلی۔

زنان خانے کی ڈیوڑھی کے باہر موجود خواجہ سرا سراج اسے اپنے ہمراہ لے کر دوبارہ نشست گاہ پہنچ چکا تھا۔

"آپ نے صاحبزادی کو ملاحظہ کیا؟" نصرت خان نے بے تابانہ سوال کیا۔

"جی۔" جونا خان کا جواب مختصر تھا۔

"کیا مرض پایا؟" نصرت خان نے اسی بے تابی سے اگلا سوال کیا۔

"ابھی کچھ کہنا قبل از وقت ہو گا۔" جونا خان نے پُرسوچ نظروں سے نصرت خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے کچھ مقوی ادویات لکھ دی ہیں، آپ شاہی شفا خانے سے منگوا لیجئے گا..... چند دنوں میں خود بخود واضح ہو جائے گا۔"

"اب آپ کب تشریف لائیں گے؟" نصرت خان نے سوال کیا۔

"شاید اب اس کی ضرورت نہ پڑے۔" جونا خان نے زیر لب کہا۔ "اور اگر ضرورت محسوس ہو، بلا بھیجئے گا، خاکسار حاضر ہو جائے گا۔"

"شکریہ ملک جونا خان۔" نصرت خان نے ممنون لہجے میں کہتے ہوئے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا جسے جونا خان نے اسی اخلاص و احترام سے تھام لیا۔

نصرت خان اسے داخلی دروازے تک اس کی سواری تک چھوڑنے آیا تھا اور جونا خان الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتا فیروز خان کے ساتھ بگھی میں سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

زرنگار کے علاج کے لئے کتنے ہی ماہر اور قابل اطباء آ چکے تھے مگر کوئی بھی اصل صورتحال کو نہ بھانپ سکا مگر اس نوجوان اور نو آموز طبیب نے لمحوں میں اصل وجہ جان لی تھی۔ زرنگار اس کی قابلیت اور لیاقت پر عش عش کر اٹھی تھی۔ شاداب بھی بے حد متاثر ہوئی تھی۔ جب سے وہ گیا تھا، زرنگار کی سیاہ آنکھوں میں اس کا سراپا محو گردش تھا، کانوں میں اس کی شیریں اور نرم آواز گونجتی اور سوچوں میں اس کا کتابی حسین چہرہ مسکراتا تھا۔

"شاداب! یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟" وہ حیران ہو کر شاداب سے سوال کرتی۔ وہ اپنے دل کی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پا رہی تھی۔

"ابھی ایک بیماری کا قضیہ چل رہا تھا کہ تمہیں دوسرا مرض لاحق ہو گیا؟" شاداب نے اس کے الجھن بھرے چہرے کی طرف دیکھ کر شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

تو وہ گھبرا کر پوچھنے لگی۔ "دوسرا مرض..... ؟ بھلا کون سا مرض.....؟"

"پتہ نہیں، ابھی ان کیفیات کو یہ نام دینا درست ہے یا نہیں۔" شاداب نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "مگر قرین قیاس یہی ہے کہ جلد ہی اس مرض کا نام عشق ہو جائے گا۔"

"ہائے اللہ....." زرنگار نے دل تھام لیا۔

اسی شام نصرت خان بیٹی کی مزاج پرسی کو آیا تھا۔

"اب کیسا محسوس کرتی ہو؟"

"پہلے سے تو افاقہ ہے....." زرنگار کی بجائے خجستہ بی نے جواب دیا۔ "پر لگتا ہے ایک آدھ بار انہیں اور زحمت دینی پڑے گی۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" نصرت خان افاقے کا سن کر خاصا خوش ہوا تھا۔ وہ ترنگ میں بولا۔ "بڑا قابل لڑکا ہے، اس کم سنی میں اس نے مختلف مضامین میں عبور حاصل کیا ہے، روشن دماغ ہے۔ منطق، فلسفہ، ریاضی، علم نجوم، شعر و ادب کے علاوہ خوش نویسی میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتا اور علم طب میں تو اس کی استعداد تم نے دیکھ ہی لی ہے۔"

"جی سرکار۔" خجستہ بی نے حیران ہو کر پلکیں جھپکائیں۔

"پنجاب کے گورنر غازی ملک کا بڑا بیٹا ہے..... سلطان معظم بھی عزت دیتے ہیں، خدا نظر بد سے بچائے، بڑا لائق اور بے مثال بچہ ہے۔"

"جی سرکار۔" خجستہ بی نے دوبارہ تائید بھرے انداز میں سر ہلایا۔

شاداب بھی پلکیں وا کئے جونا خان کی تعریفیں سن رہی تھی اور یہ سوچ کر حیران ہو رہی تھی کہ کسی ایک شخص میں کیا اتنی ڈھیر ساری صلاحیتیں ایک ہی وقت میں جمع ہو سکتی ہیں۔

اور زرنگار سوچ رہی تھی کہ میں جس عجوبہ روزگار انسان کا انتظار کر رہی تھی، کیا یہ وہی ہے؟

اس نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنی جلد اس کا خیالی پیکر حقیقت کا روپ دھار کر اس کے سامنے آ موجود ہو گا۔

اور اُسی شام نصرت خان نے خادم کے ذریعے اسے بلا بھیجا تھا اور اگلی صبح حسب سابق وہ پھر آ موجود ہوا۔

خجستہ بی اسے زنان خانے میں لے آئی تھی۔ دبیز پردے کے اس پار زرنگار شاداب کے ساتھ موجود تھی۔ آج شاداب نے اس کی لیاقت جانچنے کے لئے ایک عجب شرارت کی تھی۔ ڈوری کا ایک سرا زرنگار کی کلائی میں باندھنے کی بجائے اس کی پالتو بلی کی ٹانگ میں باندھ دیا تھا۔

جونا خان ڈوری کو ہاتھ میں تھام کر کئی لمحوں تک پلکیں جھپک جھپک کر ڈوری کی سمت دیکھتا رہا تھا۔ اس کے حسین چہرے سے حیرانی اور بے یقینی ٹپک رہی تھی، پھر کچھ سوچ کر اس نے دروازے کے باہر کھڑے سراج کو مخاطب کر کے کہا۔ "ذرا نواب صاحب کو بلا لاؤ۔"

حکم سنتے ہی وہ بجا آوری کے لئے دوڑ پڑا اور اگلے ہی لمحے نصرت خان کمرے میں آ داخل ہوا۔ اس صورتحال کو دیکھ کر جھٹ شاداب نے ڈوری بلی کے پنجے سے نکال کر زرنگار کی کلائی پر باندھ دی۔

نصرت خان کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر جونا خان احتراماً کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ خجستہ نے لپک کر دوسری کرسی قریب کھسکا دی تھی۔

"تشریف رکھئے۔" نصرت خان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کی اجازت سے میں مریضہ کی نبض محسوس کرنا چاہتا ہوں۔" جونا خان نے نگاہیں جھکا کر سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ڈوری سے کچھ اتنا زیادہ واضح نہیں ہو رہا۔"

"آپ معالج ہیں۔" نصرت خان خوش دلی سے بولا۔ "معالج اور استاد سے کیسا پردہ؟" پھر وہ خجستہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "خجستہ بی، ذرا اپنی ننھی بیگم سے کہو، ہاتھ پردے سے باہر نکال لیں۔"

"ہائے اللہ..... یہ سب کیا ہے؟" زرنگار کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ "میں نے تم سے کہا تھا، یہ شرارت مت کرو، کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔"

"اب تو جو ہونا تھا ہو چکا....." شاداب ڈھٹائی سے مسکرائی اور سرگوشی میں بولی۔ "اب آپ ذرا پردے کے پاس جا کر اپنی نازک کلائی ان کے ہاتھ میں دیجئے۔"

"اُف توبہ....." زرنگار کے گلابی رخسار گلنار ہو گئے۔

"ذرا کلائی باہر نکالئے تو۔" خجستہ نے اس کا ہاتھ تھام کر پردے سے باہر کرتے ہوئے کہا۔ مہندی کے عنابی رنگ میں اس کا گلابی ہاتھ سرخ و سفید اور ارغوانی پھولوں والے مخملیں پردے سے جھانکتا بے حد حسین لگ رہا تھا۔

جونا خان نے لحظہ بھر کو ہاتھ کی طرف دیکھا، حنائی مدھر خوشبو ہوا میں تحلیل ہو کر اس کے مشام جان میں تحلیل ہو گئی۔ اس نے اپنی مضبوط خوبصورت انگلیوں سے اس کی نازک کلائی تھام کر نبض ٹٹولنے کی کوشش کی۔ گلابی، صحت مند، چوکور ناخنوں سے سجی اس کی لمبی مضبوط انگلیاں اس کی نبض کی دھمک محسوس کر رہی تھیں اور اسے اپنے دل کی دھڑکنوں میں اضافہ ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

جونا خان کی انگلیوں کے پوروں سے ایک انوکھی تپش زرنگار کی رگوں میں گھلتی جا رہی تھی..... اُسے اپنے رگ و پے میں شعلے سے لپکتے محسوس ہو رہے تھے۔

جونا خان شعلوں کی اس لپک کو محسوس کر کے احساس کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

"سب ٹھیک تو ہے؟" نصرت خان نے جلدی سے پوچھا۔

"جی۔" جونا خان نے سر جھکا کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بظاہر تو سب علامات درست ہیں اور اگر کچھ ہوا تو میں رقعے کے ذریعے آپ کو مطلع کر دوں گا۔"

"بہتر۔" نصرت خان اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نسخہ تجویز کیجئے، میں ذرا باہر کے معاملات نمٹاتا ہوں۔"

جونا خان کاغذ پر ادویات لکھنے لگا۔

"صاحبزادی شادی شدہ ہیں؟" لکھتے لکھتے اس نے دھیمی آواز میں خجستہ بی سے پوچھا۔

"وہی تو اصل قضیہ ہے۔" خجستہ بی رو دینے والے انداز میں گویا ہوئی۔ "بڑے سرکار کے چچیرے بھائی کے صاحبزادے مراد خان سے رشتہ طے ہے، اب ان کی عادات و خصائل کے بارے میں آپ نے بھی سنا ہو گا..... تب سے ہی ننھی بیگم صاحب فراش ہیں۔ اب ایسی بیماری کمزوری میں شادی کا کیا سوال اٹھتا ہے؟"

"ٹھیک....." جونا خان نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "اب میں مرض کی اصل جڑ کو پا گیا ہوں..... میں رقعے میں تحریر کر کے قبلہ نواب صاحب کے پاس بھجوا دوں گا، اب اجازت چاہوں گا۔" یہ کہہ کر جونا خان اٹھ کھڑا ہوا۔

"کل تو آپ نے ڈوری سے مرض بھانپ لیا تھا، آج براہ راست نبض دیکھنے کی کیوں حاجت پیش آئی؟" شاداب کی شرارت بھری دھیمی آواز اُبھری۔

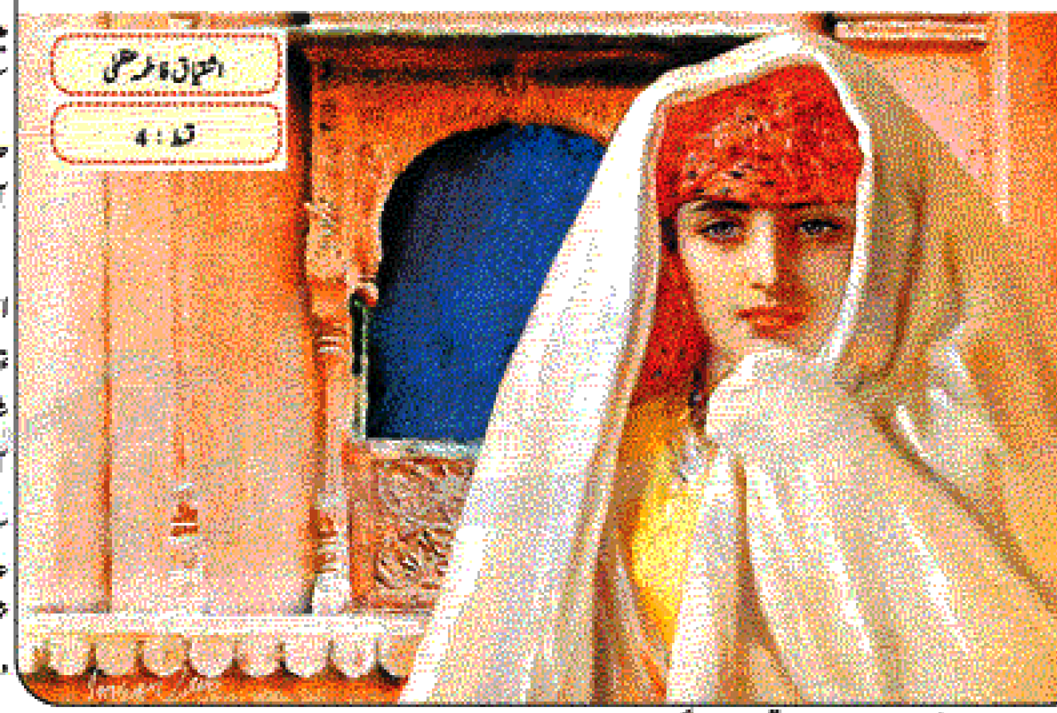
"کیونکہ پیالی بھر دودھ اور چھیچھڑوں کی خوراک تجویز کرنا، مجھے کچھ نامناسب لگ رہا تھا۔" جونا خان نے سنجیدگی سے جواب دیا اور باوقار انداز میں قدم دھرتا دروازے سے باہر نکل گیا۔

زرنگار اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑی پردے کی جھری سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس کا پورا وجود آنکھیں بن گیا تھا اور وہ آنکھیں اس شخص پر جمی ہوئی تھیں جس نے پلٹ کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔

(جاری ہے)

''زرنگار بانو بیگم، اس سے پہلے کہ جونا خان حقیقت حال کے بیان کے ساتھ اموجان کی خدمت میں رقعہ ارسال کردے، تم خود انہیں ایک رقعہ بھیج دو۔'' شاداب نے زرنگار کے دلکش چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

اس شام وہ دونوں حویلی کے پائیں باغ میں مہندی کی باڑھ کے قریب بنچ پر بیٹھی تھیں۔ زرنگار قدرے افسردہ اور دل گرفتہ دکھائی دے رہی تھی۔



''میں یہ سوچ کر خوف زدہ ہو جاتی ہوں کہ اگر جونا خان نے ساری حقیقت بابا جان کے گوش گزار کردی تو وہ جانے کیا کر گزریں؟''

''کریں گے کیا......؟'' شاداب نے آنکھیں پھیلا کر زرنگار کی طرف دیکھا۔ ''گھڑی کی چوتھائی میں بھائی جان سے تمہارے عقد کی تاریخ طے کردیں گے......اور نہیں تو کیا؟''

مراد خان سے تو زرنگار کو پہلے ہی عقد قبول نہ تھا اور اب جونا خان کو دیکھ لینے اور اس کے اوصاف جان لینے کے بعد تو گویا یہ عقد ناممکنات میں شامل ہو گیا تھا۔

''شاداب، تم تو جانتی ہو ان دو دنوں میں، میں کس کیفیت میں مبتلا ہو چکی ہوں، اب یہ دل صرف ان کے لئے ہی دھڑکتا ہے، اب اس نام کے سوا کوئی نام میرے نام کے ساتھ نہیں جڑ سکتا۔''

''اگر وارفتگی اور دیوانگی کی اس منزل کو پہنچ چکی ہو تو کوئی عملی قدم اٹھانا پڑے گا۔'' شاداب نے حوصلہ بڑھایا۔

''کیا کروں؟ وہ تو ہر احساس اور ہر جذبے سے انجان اور ناواقف ہیں۔'' زرنگار نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تم ایک رقعہ لکھ کر انابی کے ذریعے ان تک پہنچادو۔''

''ہائے اللہ، خدانخواستہ راز فاش ہوا تو مجھ سمیت بابا جان بھی کسی کو منہ دکھانے قابل نہیں رہیں گے۔'' زرنگار نے دہل کر جواب دیا۔

''یہ راز کون فاش کرے گا؟'' شاداب نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''میں......؟ انا بی یا وہ خود......یعنی جونا خان......''

زرنگار خاموشی سے اس کا چہرہ تکتی رہی۔

''ہم تینوں ہی قابل اعتبار ہیں، تم کو بے فکر ہو کر دل کا حال تحریر کرنا چاہئے، ساتھ ہی بیماری کا ڈھونگ اور اس ڈھونگ کی وجہ بھی لکھ دینا۔''

بہت غور و خوض کے بعد آخر زرنگار، جونا خان کو نامہ لکھنے پر تیار ہو گئی۔

☆......☆......☆

اس شام جونا خان، اپنے کتب خانے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے سر جھکائے فیروز بیٹھا، ہفتے بھر کی علمی کاوشوں کا احوال بیان کر رہا تھا۔ جونا خان کی خواہش تھی کہ فیروز اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرے اور اسے اپنے ساتھ دلی لانے کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا مگر فیروز خان کو طلب علم کا کوئی خاص شوق نہ تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے کی نسبت کھیل کود میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ جونا خان کو اس سے بے پناہ محبت تھی جس کے باعث وہ خود اس پر سختی کرتا، نہ ہی کسی استاد کو کرنے دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فیروز کی تعلیم کا سلسلہ نہایت سست روی سے آگے بڑھ رہا تھا۔

رہائش گاہ کے بیرونی دروازے پر ایک پالکی آ کر رکی۔ کہاروں کی پکار پر ایک خادم دوڑتا ہوا پالکی کے پاس پہنچا۔

''میں نواب نصرت خان کی خاص خادمہ ہوں۔'' خجستہ بی بی نے پالکی کا پردہ سرکا کر باہر جھانکتے ہوئے خادم سے اپنا تعارف کروایا۔ ''میں ملک جونا خان کے لئے رقعہ لائی ہوں، ان کی خدمت میں پیش کردو......ان سے عرض کردینا کہ خادمہ پالکی میں بیٹھی جواب کی منتظر ہے......زبانی یا تحریری، اسی وقت جواب عنایت کردیں۔''

''جی بہتر......'' خادم نامہ لے کر تیزی سے مکان کے اندر چلا گیا۔

جونا خان کئی لمحوں تک حیران نظروں سے نامے کو دیکھتا رہا، پھر اس نے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں پڑھتا جاتا تھا، اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے جاتے تھے۔

زرنگار بانو نے لکھا تھا۔

آپ ایک روشن دماغ اور دانا انسان ہیں، آپ پہلے ہی دن جان گئے تھے کہ مجھے کوئی مرض نہیں، یہ سچ ہے۔ بیماری کا یہ ڈھونگ میں نے محض اس لئے رچایا تھا کہ مراد خان جیسے بداطوار شخص سے شادی سے بچا جاسکے......کیا اس سلسلے میں آپ مجھے کوئی مشورہ دے سکتے ہیں کیونکہ تمام تر تگ و دو کے باوجود وہ تلوار ہنوز سر پر لٹک رہی ہے؟''

''پالکی میں بیٹھی بی بی جواب کی منتظر ہیں۔'' خط پڑھ کر جونا خان کو سوچوں میں مستغرق دیکھ کر خادم نے مؤدبانہ انداز میں اُسے یاد دلایا۔

''تم ان سے کہہ دو، کل صبح ہم خود آ کر جواب دیں گے۔''

اور اگلی صبح پردے کے دوسری جانب کھڑے ہو کر جونا خان نے اسے کہا تھا۔ ''آپ ایک تعلیم یافتہ اور بالغ لڑکی ہیں، آپ کسی ناپسندیدہ شخص سے عقد سے انکار کا پورا حق رکھتی ہیں۔''

''میرے لئے یہ ممکن نہ ہوگا۔'' زرنگار کی مایوس آواز ابھری۔

''تو پھر آپ کے لئے یہ خوشخبری ہے کہ سلطان معظم جلد ہی یہ قانون نافذ کرنے والے ہیں جس کے تحت امراء، نوابین آپس میں رشتے ناتے نہیں کرسکیں گے۔ اس قانون کے نافذ ہوتے ہی یہ ناتا آپ ہی آپ ٹوٹ جائے گا۔''

''اوہ اچھا......!'' زرنگار حیران ہوئی۔

''اب اجازت چاہوں گا۔'' جونا خان واپسی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ایک گزارش اور تھی۔'' زرنگار نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کہا۔

''فرمایئے۔'' وہ اپنی جگہ تھم گیا۔

''اگر کوئی لڑکی اپنی پسند کے کسی شخص سے عقد کی آرزو رکھتی ہو......تب؟'' زرنگار نے دھڑکتے لہجے میں آخر دل کی بات کہہ ہی دی۔

''تب اسے اپنے بزرگوں کے سامنے اپنی آرزو کا اظہار کردینا چاہئے۔'' جونا خان کا جواب تھا۔

''کیا اسلام میں ایسی کوئی گنجائش ہے کہ وہ لڑکی اس شخص سے براہ راست سوال کرسکے؟''

''بالکل ہے۔'' جونا خان نے دوٹوک جواب دیا۔ ''اسلام میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب خاتون نے خود شادی کا پیام بھجوایا۔''

''کیا میں ایسا کرسکتی ہوں؟'' زرنگار نے دھیمے لہجے میں سوال کیا۔

''ہاں، کیوں نہیں۔'' جونا خان کا جواب تھا۔

''تو......ملک جونا خان۔'' زرنگار نے اپنی تمام ہمتیں مجتمع کرکے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں، زرنگار بانو بنت نصرت خان، آپ سے عقد کی آرزومند ہوں۔''

جونا خان نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زرنگار کی طرف سے یہ سوال آئے گا۔ لحظہ بھر کو وہ اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا۔

''کیا آپ مجھے یہ خوش بختی عطا کرسکتے ہیں؟'' اُسے ساکت و جامد پاکر زرنگار نے دوبارہ سوال کیا۔

''بی بی، میں نے اب تک اس سلسلے میں نہیں سوچا۔'' کئی لمحوں بعد وہ گلا صاف کرکے نیچی آواز میں گویا ہوا......''فی الوقت حصول علم ہی میرا اوّلین شوق ہے......آنے والے چند سالوں تک میرا عقد کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''میں آپ کا ارادہ بننے تک انتظار کرسکتی ہوں۔'' زرنگار نے صاف آواز میں جواب دیا۔

''اور اگر یہ ارادہ کبھی بن ہی نہ پایا تو؟''

''تو میں زندگی کے آخری لمحے تک آپ کی راہ دیکھوں گی......جب کبھی آپ کا ارادہ بن جائے تو میرے گھر تشریف لے آئیے گا۔ آپ کی خاطر یہ دروازہ ہمیشہ کھلا رہے گا......اور یہ آنکھیں تاحیات آپ کی منتظر رہیں گی۔''

جونا خان نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔ سامنے پردوں کے درمیان زرنگار اپنی تمام تر رعنائیوں سمیت آنکھوں میں امید کی شمعیں جلائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جونا خان نے اگلے ہی لمحے نگاہیں جھکالی تھیں اور کوئی جواب دیئے بنا تیزی سے واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

اس کی زندگی میں عشق و محبت اور شادی جیسی چیزوں کے لئے فرصت تھی نہ گنجائش، وہ ایک نرالی سوچ رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس کے خواب عام انسانوں سے بالکل الگ تھے......وہ اپنے دور کے انسانوں سے سو سال آگے کی سوچ رکھتا تھا۔

☆......☆......☆

قصر ہزار ستون کی بالائی منزل پہ سلطان علاء الدین خلجی کی کشادہ آراستہ خواب گاہ کے اندرونی محرابی دروں میں جھولتے حریری پردوں سے ہوا کے نرم جھونکے اٹھکیلیاں کرتے کمرے کی خواب ناک فضا کو گدگدا کر جگا رہے تھے۔ وسیع خواب گاہ کے فرش پر دبیز ایرانی قالین بچھے تھے۔ مسہری کے داہنی جانب چاندی کی چھوٹی میز پر چاندی کی صراحی میں آب یخ دھرا تھا۔ کبھی اسی میز پر ساغر و مینا سجے ہوتے تھے مگر جب سے سلطان نے شراب نوشی سے توبہ کی تھی، اس کمرے میں کیا، پورے شہر اور پورے ملک میں شراب کی کشید، خرید و فروخت اور پینا ممنوع قرار دے دیا گیا تھا۔ خود سلطان نے اپنا مے کدہ اور شراب کے ظروف توڑ دیئے تھے۔ اس روز بدایوں کے باہر اس قدر شراب بہائی گئی تھی کہ زمین نشے میں ڈوب گئی تھی۔

پچھلے کئی ہفتوں سے سلطان خلجی کی طبیعت ناساز تھی۔

سلطنت کے مسائل، جنگی مہمات، آئے دن کی بغاوتوں کا سدباب اور سب سے بڑھ کر بڑھتی ہوئی عمر......ان سب چیزوں نے سلطان کو بیمار ڈال دیا تھا۔ آج جبکہ اُسے اپنے بیٹوں اور ملکہ کی توجہ اور تیمارداری کی ضرورت تھی، وہ سب اس سے گریزاں اور نالاں تھے۔ اس کے بیٹوں خضر خان، شادی خان اور مبارک شاہ کی مشترکہ رائے تھی کہ ایک کم ذات نومسلم غلام ملک کافور کی صحبت کے باعث سلطان علیل و لاغر ہوا تھا۔ وہ سب ملک کافور سے شدید نفرت کرتے اور اسے تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

سلطان زادے ہی نہیں تمام امراء بھی اس خواجہ سرا سے عاجز و بیزار تھے مگر اس نے اپنی خدمت گزاری اور چرب زبانی سے سلطان کے دل میں ایسی جگہ بنائی تھی کہ اس کے سوا سلطان کو کچھ اور دکھائی ہی نہ دیتا تھا اور وہ آٹھوں پہر سائے کی طرح سلطان کے ساتھ لگا رہتا تھا اور موقع ملتے ہی ملکہ اور شہزادوں کے خلاف سلطان کے ذہن میں زہر انڈیلنے لگتا۔

''جاؤ......ذرا ملکۂ جہاں کو بلا کر لاؤ۔'' سلطان نے نرم بستر پر کسمساتے ہوئے دروازے پر ایستادہ خادم کو حکم دیا۔ خادم نے لحظہ بھر کو سلطان کے بستر کے قریب کھڑے ملک کافور کی طرف دیکھا اور اس کا مخصوص اشارہ پاکر کورنش بجالاتا تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔

''دیکھتے ہو ملک کافور، پیغام بھیجا جائے، بلوایا جائے تو کوئی آئے تو آئے ورنہ خود سے کسی کو خیال نہیں آتا۔'' سلطان نے شکوے بھرے لہجے میں ملک کافور کو مخاطب کرکے کہا۔

''سچ فرماتے ہیں سلطان معظم۔'' ملک کافور نے دکھ بھرے انداز میں سر ہلایا۔ ''کل شام کو میں نے از خود شادی خان کو بلا بھیجا تھا کہ گھڑی بھر کو آپ کے پاس عیادت کو آجائیں مگر انہوں نے......'' ملک کافور نے عورتوں کے سے انداز میں ایک ہاتھ کو ماتھے پر رکھ کر ناگن کی طرح بل کھا کر رخ دوسری طرف گھمالیا۔

''کیا جواب دیا اس نے؟'' سلطان کے لہجے میں حیرت کے ساتھ بے نام سا قلق بھی شامل تھا۔

''انہوں نے کہا، بس سرکار......میں بتا نہیں سکتا۔'' اس نے عاجزی سے ہاتھ جوڑے۔

''اس نابکار نے جو کچھ بھی کہا، ہم تمہیں حکم دیتے ہیں کہ ہمارے سامنے من و عن بیان کردو۔'' سلطان نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''سرکار، شاہ زادے نے کہلوا بھیجا، اس سٹھیائے ہوئے بڈھے کے پاس بیٹھ کر کون اپنا وقت ضائع کرے۔''

''کیا ؟'' ملک کافور کی بات سن کر سلطان کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ''اس بدبخت نے ہمیں سٹھیایا ہوا بڈھا کہا......'' وہ طیش میں بستر سے اٹھ بیٹھا تھا۔ ''یہ زن مرید......ہمیشہ سے ایسا ہی بدزبان اور نالائق ہے۔''

تب ہی وہ خادم لوٹ آیا جو ملکۂ جہاں کو بلانے کے لئے گیا تھا۔

سلطان نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''ملکۂ جہاں مصروف ہیں، آج چھوٹے شاہ زادے عمر خان کی پانچویں سالگرہ ہے۔ ملکۂ عالیہ نے ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا ہوا ہے۔''

''کیا ؟'' سلطان نے حیران نظروں سے پہلے خادم کو، پھر ملک کافور کو دیکھا۔ ''ہمارے بغیر بچوں کی خوشیاں منائی جارہی ہیں، کسی کو ہم سے رسماً کہنے کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ تم دیکھ رہے ہو، ملک کافور......''

''جی سرکار، میں تو روز ہی دیکھتا ہوں، آج کل ملکۂ عالیہ روز ہی کوئی نہ کوئی جشن اور تقریب منا رہی ہوتی ہیں، کبھی کسی پوتے کی چھٹی، کبھی کسی کا ختنہ، کبھی موتڈن اور کبھی سالگرہ......اور اس طرح خوشیاں مناتے سمے وہ یہ بات بالکل بھول جاتی ہیں کہ ان کے سر کا تاج بستر پر پڑا کراہ رہا ہے۔''

''آہ! ملک کافور۔'' سلطان کے لبوں سے ایک کراہ نکلی اور وہ دھپ سے بستر پر گر گیا۔

جب سے سلطان علاء الدین خلجی بیمار پڑا تھا اور اس کے قریب اس کے غلام ملک کافور کے سوا اور کوئی نہ پھٹکتا تھا۔

اس کے رشتے داروں، بیٹوں، بیویوں، افسروں اور امراء، وزراء سب ہی نے اس سے لاپروائی برتنی شروع کردی تھی۔ ایسے میں سلطان کا برافروختہ ہونا بجا تھا۔ ملک کافور، جسے اس نے سپہ سالار بنایا تھا، ان حالات میں خود سلطان بننے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اس نے نہایت عیاری سے ایک منصوبہ تیار کیا تھا اور بڑی چابک دستی سے اس منصوبے پر عمل پیرا تھا۔

''ملک کافور، خضر خان کو طلب کرو۔'' اچانک ہی سلطان نے پُرجلال آواز میں حکم صادر فرمایا۔

''سلطان معظم، خضر خان اپنے ماموں اور ہونے والے خسر الغ خان کے ساتھ گجرات میں ہیں۔'' ملک کافور نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ فرماتے ہیں تو میں پیغام بھجوائے دیتا ہوں مگر مجھے توقع نہیں کہ وہ آنے کی زحمت فرمائیں گے......''

''انہیں حکم شاہی بھیجو کہ وہ دونوں فوراً ہماری خدمت میں حاضر ہوں۔'' سلطان نے آگ بگولا ہوتے ہوئے حکم دیا۔

الغ خان ولی عہد خضر خان کا ماموں اور خسر تھا۔ وہ ملک کافور کی آنکھوں میں بہت کھٹکتا تھا، اس لئے کہ وہ خضر خان کا پشت پناہ تھا۔ اُسے دہلی پہنچنے میں دیر ہو گئی۔ ادھر سلطان کی طبیعت اور خراب ہو گئی۔ اس حالت میں ملک کافور نے اس کی دن رات خدمت کرکے اس کا دل اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اس کے دل و دماغ پر اس طرح حاوی ہو گیا کہ اب سلطان اس کی آنکھوں سے دیکھتا اور اس کے دماغ سے سوچتا۔ وہ ہر وقت سلطان کی خدمت میں حاضر رہتا، اپنی وفا اور محبت کا یقین دلاتا اور موقع ملتے ہی شہزادوں اور دیگر امراء کے خلاف اس کے کان بھرنے لگتا۔

حقیقت یہ ہے کہ سلطان کے بیٹے تھے بھی نالائق۔ اس نے دراصل اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت پر کبھی کوئی توجہ نہ دی تھی اور انہیں کاروبار سلطنت سے ہمیشہ دور رکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نا صرف حکومت بلکہ باپ سے بھی وہ دور ہو گئے تھے۔ سلطان کی بیماری نے طوالت کھینچی تو بیوی اور بیٹوں نے اس کی تیمارداری اور اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو سلطان ملک کافور کی طرف مزید راغب اور بیٹوں کی طرف سے متنفر ہوتا گیا۔

ملک کافور نے سب سے پہلے سلطان کو دونوں بڑے شہزادوں خضر خان اور شادی خان کی طرف سے بدگمان کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ اس نے الغ خان کی شکایت بھی جاری رکھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نے الغ خان کو قتل اور خضر خان اور شادی خان دونوں شاہ زادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کردینے کا حکم صادر فرمایا۔

ملک کافور نے دونوں شاہ زادوں کو گوالیار کے قلعے میں قید کروادیا اور الغ خان کو جو دہلی کی سمت آرہا تھا، راستے میں ہی قتل کروادیا۔

☆......☆......☆

اُس شام ملک جونا خان اپنے مکان کے صحن میں چہل قدمی کر رہا تھا، تب ہی ایک ایلچی نے آ کر اطلاع دی تھی کہ سلطان معظم کی طبیعت سخت ناساز ہے، انہوں نے جونا خان کو طلب کیا ہے۔

جونا خان فوری طور پر نکل کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا قصر ہزار ستون کی جانب رواں دواں تھا کہ اسے دور سے ایک شخص آتا نظر آیا۔ اس نے اشارے سے جونا خان کو رکنے کے لئے کہا۔ جونا خان نے گھوڑے کی راسیں کھینچ کر گھوڑا ٹھہرالیا۔

''کیسے ہیں ملک جونا خان؟'' آنے والے نے دور سے ہی دوستانہ انداز میں بازو لہراتے ہوئے جونا خان کو مخاطب کیا۔ جونا خان نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ نواب نصرت خان تھا۔

اور اُسے دیکھتے ہی اسے بے ساختہ اس کی بیٹی زرنگار بانو یاد آگئی۔ مہینوں بیت گئے تھے، پھر اس طرف سے کوئی نامہ و پیام آیا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا۔

''اوہ، نواب صاحب آپ؟'' جونا خان گھوڑے سے نیچے اُتر آیا اور بڑے تپاک سے نصرت خان سے بغلگیر ہوا۔

''اب تو دربار لگتا ہی نہیں کہ کبھی کبھار وہیں ملاقات ہو جاتی تھی۔'' نصرت خان نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''آپ سنایئے، کیسی گزر رہی ہے؟''

''اللہ کا کرم ہے......پچھلے دنوں، میں بابا جان کے پاس دیپال پور گیا ہوا تھا، دو روز قبل ہی واپس لوٹا ہوں۔'' جونا خان نے نرم لہجے میں بتایا۔

''اس وقت کہاں کا قصد ہے؟'' نصرت خان نے پوچھا۔

''سلطان معظم کی طرف سے بلاوا آیا تھا، ان کی طبیعت ناساز ہے......یاد فرمایا ہے۔'' جونا خان نے جواب دیا۔

''ان کی طبیعت تو مہینوں سے ناساز ہے۔'' نصرت خان نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر انہوں نے آپ کو اب یاد کیا ہے جبکہ میں جانتا ہوں، وہ آپ کی علمی لیاقت پر بے حد بھروسا رکھتے ہیں۔''

''جی یہ ان کی عنایت ہے۔'' جونا خان سعادت مندی سے بولا۔ ''کئی بار میں نے خود سے سوچا کہ ان کی عیادت کو جاؤں مگر......'' وہ کہتے کہتے رک گیا۔

''اچھا ہوا آپ نہیں گئے کیونکہ شاید آپ کا جانا بے کار ہی ثابت ہوتا......کیونکہ ملک کافور کسی کو بھی سلطان سے ملنے نہیں دیتا۔'' نصرت خان کی آواز دھیمی ہو گئی تھی۔

''اوہ......!'' جونا خان کے لب پُرتشویش انداز میں سکڑ گئے مگر اس نے اس خبر پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔

''چلئے، پھر ٹھیک ہے۔'' نصرت خان نے گہرا سانس لے کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ''تو آپ سدھاریے......میں نے بھی سوچا ہے کہ ایک آدھ دن میں، میں بھی ملاقات کی کوشش کروں گا۔''

''جی بہتر۔'' جونا خان نے مصافحے کے لئے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''اللہ نگہبان۔''

نصرت خان الوداعی انداز میں سر کو جنبش دیتا آگے بڑھ گیا تھا جبکہ جونا خان گھوڑے پر سوار ہو کر قصر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔

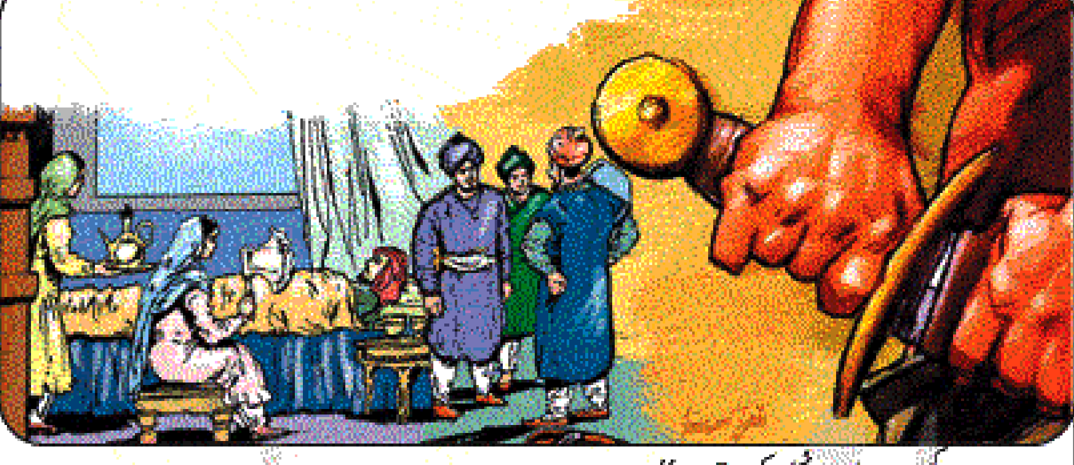
قصر کے بیرونی گیٹ پر متعین حفاظتی دستے نے اُسے اندر جانے دیا تھا۔ وہ تیزی سے قصر کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔ قصر میں موجود خدام، خواجہ سرا اور دیگر عملہ جونا خان کو پہچانتا تھا۔ وہ امیر آخور تھا، اس ناتے سے اکثر سلطان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، دوسرے وہ ایک اچھا طبیب تھا جس پر وہ بھروسا کرتا تھا اور کسی بھی معمولی تکلیف میں بھی اسے طلب کرتا تھا اور تیسرے وہ ملک غازی کا بیٹا تھا اور ملک غازی کی قصر دربار اور اہل دربار کی نگاہوں میں بے حد عزت تھی۔

وہ بنا روک ٹوک سیڑھیاں طے کرتا بالائی منزل پر پہنچ گیا۔ راہداری میں متعین خدام نے اُسے جھک کر سلام کیا اور سلطان کی خواب گاہ تک رہنمائی کی۔

"جی فرمایئے۔" خواب گاہ کے دروازے پر متعین خنجر بردار دربانوں نے انجان نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جونا خان نے چونک کر سر اٹھایا۔ آج دربانوں کے چہرے نئے لگ رہے تھے، غالباً ملک کافور نے سابقہ دربان تبدیل کر دیئے تھے۔

"میں ملک جونا خان ہوں اور سلطان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔" جونا خان نے اپنا تعارف کروایا۔

"ایسا ممکن نہیں ہے۔" ایک خادم نے جواب دیا۔ "ان کی طبیعت



ناساز ہے اور وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتے......"

"مجھے خود انہوں نے طلب کیا ہے...... میں طبیب بھی ہوں۔"

خدام نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر ذرا سا گردن گھما کر ایک اور خادم کو قریب بلایا۔

"یہ طبیب ہیں اور سلطان معظم کے طلب کرنے پر انہیں دیکھنے آئے ہیں۔" دروازے پر متعین دربان کی بات سنتے ہی وہ خادم اندر چلا گیا اور چند ہی لمحوں بعد دروازے پر ملک کافور کا چہرہ نمودار ہوا۔

ملک کافور ایک نومسلم غلام تھا۔ سلطان علاء الدین کی سیاسی غلطیوں میں ایک بڑی غلطی یہ بھی تھی کہ اس نے ملک کافور کو غیر معمولی اہمیت دی تھی۔ امرائے دربار ملک کافور کے اثر ورسوخ سے نالاں تھے مگر سلطان کی وجہ سے خاموش تھے۔ وہ ملک کافور کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے اور اسے کسی تکریم واقتدار کا مستحق نہیں سمجھتے تھے مگر سلطان کو ایک ضد سی ہوگئی تھی، کہ کیونکہ وہ ملک کافور پر مہربان ہے لہٰذا سب کو اس کی عزت کرنی چاہئے چنانچہ اس نے امراء کی مخالفت کے باوجود ملک کافور کو "ملک نائب" کا خطاب عطا کر دیا۔

"اوہ جناب تشریف لائے ہیں۔" وہ جونا خان کو دیکھ کر بولا۔ وہ نا صرف اس سے خوب اچھی طرح واقف تھا بلکہ اس کی عزت بھی کرتا تھا کیونکہ وہ ایک قابل اور بہادر افسر تھا اور ملک غازی جیسے دلیر سپہ سالار اور قابل انسان کا چہیتا بیٹا تھا۔ وہ ملک غازی کی محتاط اور اپنے کام سے کام رکھنے والی عادت کو پسند کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی ہی دنیا میں خوش اور مگن رہتا تھا۔ اس نے کبھی ناجائز دلی کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی تھی اور نا ہی دیگر امراء و وزراء کی طرح کبھی اسے نظر حقارت سے دیکھا تھا۔

"جی......" جونا خان نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے قصر کے کسی خادم نے اطلاع دی تھی کہ سلطان معظم نے مجھے طلب کیا ہے۔"

ملک کافور نے موٹے موٹے ہونٹوں پر مکارانہ مسکراہٹ بکھری۔

"آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے...... سلطان معظم کی طبیعت اب پہلے سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور وہ آج کل میں دربار بھی لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں...... مجھے افسوس ہے کہ آپ کو بلاوجہ زحمت اٹھانی پڑی، اس وقت آپ سلطان معظم سے ملاقات نہ کر سکیں گے...... دربار میں تشریف لے آیئے گا، سلطان کا دیدار ہو جائے گا۔"

"بہتر۔" جونا خان نے عجیب نظروں سے ملک کافور کی طرف دیکھتے ہوئے واپسی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔ وہ سیڑھیاں اترتے وقت سوچ رہا تھا کہ ملک نصرت خان کا اندازہ کس قدر درست تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنے والد ملک غازی کے نام ایک نامہ تحریر کیا۔

بابا جان! دلی کی فضا عجیب اور قصر سلطان کا ماحول عجیب تر ہو گیا ہے۔ آج میرا قصر میں جانے کا اتفاق ہوا...... ہر سمت ایک سازشی فضا محسوس ہوئی...... طوفان کے آنے سے قبل کا سکوت طاری تھا...... ہر سمت ایک عجیب سی دہشت، ویرانی اور اداسی تھی۔

ملک غازی نے بیٹے کو جواباً لکھا۔

لخت جگر...... کسی بھی معاملے میں دخل در معقولات کی حاجت نہیں، حالات جب تک سازگار رہتے ہیں، دلی میں رہو اور جب رہنا ناگوار گزرنے لگے تو دیپال پور لوٹ آنا۔

جونا خان کو باپ کا مشورہ پسند آیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ اگر حالات اسی نہج پر چلتے رہے تو وہ فیروز خان کو لے کر باپ کی جاگیر پر چلا جائے گا۔

وہ اٹھ کر روزن میں آ کھڑا ہوا۔

نیلے آسمان کی وسعتوں میں چودھویں کا چاند اپنی تمام تر رعنائیوں اور تابانیوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ چاندنی کے سنہری غبار میں ٹمٹماتے تاروں کا روپہلا اُجالا بھی مدغم تھا۔ جونا خان یک ٹک چاند کی اور دیکھے گیا...... اور جانے کیسے آپ ہی آپ اس کا دھیان زرنگار بانو کی طرف چلا گیا۔ اس دمکتے چاند اور اس کے دلنشین چہرے میں کوئی مماثلت اور مشابہت تھی ضرور...... اسے چاند دیکھ کر زرنگار کا چہرہ یاد آ گیا تھا۔ وہ پردے سے نکل کر بے اختیار اس کے سامنے آ گئی تھی۔ اُسے اس کی یہ ادا ناگوار نہیں گزری تھی، اس کے اس بے ساختہ امر میں بے حیائی نہیں بلکہ جنوں خیزی کا عنصر شامل تھا...... مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ اس کی زندگی میں کسی دل کے جنوں اور کسی چہرے کے فسوں کے لئے گنجائش ہی نہ تھی، اس کی سوچیں کسی اور ہی ڈگر کی مسافر تھیں اور اس کے خوابوں کی منزل کچھ اور ہی تھی۔

☆......☆......☆

اگلی شام نواب نصرت خان نے سلطان سے ملاقات کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تیار ہو کر نکلنے کا قصد ہی کر رہا تھا کہ فجستہ بی بی آ گئی۔

"سرکار! کہیں تشریف لے جا رہے ہیں؟" اس نے نصرت خان کو تیار دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

"ہاں، میں ذرا سلطان معظم کی عیادت کو جا رہا ہوں۔"

"بہتر ہوتا پہلے آپ ننھی بیگم کی عیادت کر لیتے۔" فجستہ نے سر جھکا کر مری ہوئی آواز میں کہا۔

"کیا ہوا زرنگار کو؟" نصرت خان نے چونک کر حیرت سے پوچھا۔

ملک جونا خان کے علاج کے بعد سے رفتہ رفتہ وہ بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ سلطان کے حکم کے بعد سے امراء کے آپسی رشتوں ناتوں پر کیونکہ پابندی عائد کر دی گئی تھی چنانچہ مراد خان سے اس کی شادی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ بات وہیں ختم ہو گئی تھی۔ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ اظفر خان نے اپنے بیٹے مراد خان کا عقد کسی ہمسائے کی بیٹی سے کر دیا تھا کیونکہ شاداب بانو بیاہ کر متھرا جا بسی تھی، اس لئے زرنگار کو کسی طرف سے کوئی خبر نہ ملتی تھی۔

"دو روز سے تیز بخار ہے...... بستر پر پڑی کراہ رہی ہیں۔" فجستہ بی بی نے سوکھا سا منہ بنا کر اطلاع دی۔ "اس وقت ممکن ہو تو کسی حکیم، طبیب کو بلوا دیجئے...... ورنہ کل صبح تو ضرور ہی یہ کام کیجئے گا۔"

"اچھا۔" نصرت خان نے پُرسوچ انداز میں سر ہلایا۔ "چلو اس وقت میں خود اس کی عیادت کر لیتا ہوں۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا زنان خانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

زرنگار بانو بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔

جونا خان سے ملاقات اور اس کی محبت میں یکطرفہ گرفتار ہو جانے کے بعد اس کی دنیا ہی بدل گئی تھی۔ روح میں بے کلی اور آنکھوں میں انتظار سا گیا تھا۔ جانتی تھی یہ طلب لاحاصل اور یہ انتظار بے معنی ہے مگر وہ اپنے دل کا کیا کرتی، وہ تو صرف اُسی دشمن جان کا نام لئے جاتا تھا۔ اُس ناسے کے بعد اس نے پھر کسی نامہ و پیام کی کوشش اور ملاقات کی آرزو نہ کی تھی۔ جونا خان تک اس کے احساسات پہنچ چکے تھے۔ اب اگلا قدم اسی کی طرف سے اٹھایا جانا چاہئے تھا...... سو وہ ہونٹوں پر سکوت اور آنکھوں میں انتظار کے دیئے جلائے، اس کے قدم اٹھائے جانے کی راہ تک رہی تھی۔

شاداب بانو کی متھرا رخصتی کے بعد وہ بے حد تنہا ہو گئی تھی اور تنہائی اور محرومی کے اس احساس نے اس کی روح کو بے کل کر دیا تھا...... اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ بستر سے جا لگی تھی۔

"زرنگار بانو......" نصرت خان نے بیٹی کو پیار بھرے لہجے میں پکارا۔

"بابا جان۔" اس نے آہستگی سے کروٹ بدل کر دروازے کی طرف دیکھا، جہاں نصرت خان آنکھوں میں حیرت اور افسوس لئے بیٹی کا بیمار اور پژمردہ چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"کیسی طبیعت ہے لاڈلی؟" وہ پیار بھرے لہجے میں پوچھتا قریب چلا آیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بابا جان۔" وہ نقاہت بھری آواز میں بولی۔ "یہ انا بی بلاوجہ ہی آپ کو پریشان کرنے کے لئے یہاں لے آئی ہیں۔"

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے زرنگار۔" اس نے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "خیر فکر کی کوئی بات نہیں...... میں کل صبح ہی ملک جونا خان کو بلوا بھیجتا ہوں۔"

"ملک جونا خان۔" زرنگار کے ساکت لبوں نے اس نام کا بوسہ لیا اور اس کا دل بے ساختہ دھڑک اٹھا۔

"مگر سنا ہے وہ دیپال پور گئے ہوئے ہیں۔" فجستہ بی بی نے آگے بڑھ کر کہا۔

"نہیں ابھی دو روز قبل ہی تو سرِ راہ ان سے ملاقات ہوئی ہے۔" نصرت خان نے وضاحت کی اور واپسی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب چلتا ہوں، اپنا خیال رکھنا۔" اس نے جھک کر ایک بار پھر زرنگار کی پیشانی پر ہاتھ رکھا اور آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ تب ہی بالکل اچانک ہی دروازے کے کنڈے میں اس کا پٹکا اٹک گیا اور وہ ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔

"الٰہی خیر۔" زرنگار بے ساختہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ نصرت خان جھک کر کنڈے سے اپنی کمر کا پٹکا علیحدہ کر رہا تھا۔ فجستہ بی بی نے آگے بڑھ کر مدد کرنی چاہی مگر تب تک وہ پٹکا چھڑا کر دروازے سے باہر نکل گیا تھا۔

"انا بی! یہ تو اچھا شگن نہیں ہے۔" زرنگار نے پریشان نظروں سے فجستہ کو دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اللہ بخشے دادی جان مرحومہ اسے بہت ہی بڑی علامت قرار دیتی تھیں...... آپ ذرا لپک کر بابا جان کا صدقہ تو نکالئے۔"

"جی بہتر۔" فجستہ خود بھی اس وقت سے ہراساں و پریشان کھڑی تھی۔ زرنگار کی بات سن کر تیزی سے باہر کی طرف لپکی۔

☆......☆......☆

چنے کی دال، سرسوں کا تیل، سرخ مرچیں اور مرغی کا انڈا، اس کے علاوہ گیارہ اشرفیاں بھی صدقے کی سینی میں دھری تھیں۔

"یہ کیا فجستہ بی؟" نصرت خان نے حیرت سے یہ سب دیکھا۔

"صدقہ ہے سرکار، بس آپ اس سینی کو ہاتھ لگا دیجئے۔" فجستہ بی بی کے کہنے پر نصرت خان نے مسکراتے ہوئے سینی کو چھو کر قدم باہر کی طرف بڑھا دیئے۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار قصر ہزار ستون کی جانب محو سفر تھا۔

قصر کے سارے دربار چوبدار، غلام، خدام اُسے پہچانتے تھے۔ وہ سلطان سے قریب ترین ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اس کی اپنی ایک تکریم تھی۔ وہ بیرونی دروازے سے گزر کر رہائشی عمارت تک پہنچ گیا اور گھوڑے سے اتر کر سیڑھیوں کی جانب بڑھ گیا۔ سیڑھیوں سے چڑھ کر جوں ہی وہ بالائی منزل پر آیا، اس نے دیکھا کہ سارے ہی غلام اور خواجہ سرا تبدیل کر دیئے گئے ہیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑا اِدھر اُدھر آتے جاتے خواجہ سراؤں کو حیرت سے دیکھ رہا تھا، تب ہی دو خواجہ سرا اس کی طرف لپکے۔

"آپ اوپر کیسے آ گئے؟" ایک نے بدتہذیبی سے سوال کیا۔ "آپ کو کیا معلوم نہیں کہ ملک کافور کی اجازت کے بغیر یہ سیڑھیاں چڑھنا منع ہے؟"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ملک کافور پر۔" نصرت خان ایک دم غصے میں آ گیا۔ "میں سلطان معظم کا قریبی رفیق نصرت خان ہوں اور نصرت خان کو کسی غلام سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔"

نصرت خان کی اونچی آواز ذرا فاصلے پر واقع سلطان خلجی کی خواب گاہ تک پہنچ رہی تھی۔ ملک کافور فوراً ہی دروازہ کھول، لپک جھپک سیڑھیوں کے قریب آ پہنچا۔

"آپ یہاں کھڑے شور مچا کر سلطان معظم کو کیوں پریشان کر رہے ہیں؟" اس نے سوال کیا۔

"میں سلطان معظم سے ملاقات کے لئے آیا ہوں۔" نصرت خان نے غصہ ضبط کرتے ہوئے بھاری آواز میں کہا۔ "اور ملے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔"

"سلطان معظم سو رہے ہیں، اس وقت آپ ان سے نہیں مل سکتے۔" ملک کافور نے جواب دیا۔

"میں اس سے قبل تین بار مختلف اوقات میں آ چکا ہوں، ہر بار مجھے یہی جواب ملتا ہے۔" نصرت خان تنک کر بولا۔ "آخر ایسی کیا بات ہے کہ تم ان سے کسی کو ملنے نہیں دیتے...... لگتا ہے تم نے انہیں قید کر رکھا ہے۔"

"اگر ایسا بھی ہے تو تجھے کیا؟" ملک کافور نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔ "تو اپنی نبیڑ، تجھے دوسروں سے کیا؟"

اس کا گستاخانہ لہجہ نصرت خان کو چراغ پا کر گیا۔

"دو کوڑی کے غلام، تو مجھ سے زبان لڑانے کی گستاخی کر رہا ہے۔" نصرت خان نے چیخ کر کہا۔ "تو نے جو منصوبہ بنایا ہے، میں اسے بھانپ گیا ہوں، تو دیکھ میں اب کیا کرتا ہوں، میں ابھی تمام امراء، وزراء کو جمع کروں گا اور تیری اس اجارہ داری کا سدِ باب کر کے دم لوں گا۔"

"ہونہہ!" چند لمحوں تک ملک کافور اس کی طرف حقارت بھری نظروں سے تکتا رہا، پھر ہنکارہ بھر کے پلٹ گیا۔ نصرت خان غصے میں بھرا واپسی کے لئے مڑا۔

"تو زندہ سلامت گھر پہنچے گا تب ہی تو کچھ کر سکے گا۔" ملک کافور نے زہر خند سے سوچا اور دور کھڑے اپنے ساتھی خواجہ سرا کو جسے اس نے حال ہی میں اپنے گاؤں سے یہاں بلوایا تھا، اشارے سے قریب بلایا۔ وہ خواجہ سرا کہ جس کا نام سورج تھا، تیزی سے لپکتا، اس کے قریب چلا آیا۔

☆......☆......☆

غصے میں کھولتا، ایک ساتھ کئی کئی زینے اُترتا نصرت خان نیچے پہنچا تھا اور گھوڑے پر سوار ہو کر گھر کی جانب روانہ ہو گیا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ پہلے امیر الپ خان کے گھر جائے مگر پھر ہر سمت رات کے سائے پھیلتے دیکھ کر اس نے سوچا کہ اس وقت کسی کے گھر جانا مناسب نہ ہو گا، تو کیوں نہ یہ کام کل صبح کے لئے اُٹھا رکھا جائے اور الپ خان کے ساتھ دیگر امراء اور وزراء کو بھی بلوا کر اس مسئلے پر گفت وشنید کی جائے۔ اس کے دل میں کہیں ہلکا سا یہ شبہ بھی تھا کہ کہیں دیگر لوگ اس سلسلے میں اس کی مدد کرنے سے انکار ہی نہ کر دیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سلطان خلجی کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ اس کی سخت روی، درشت مزاجی اور طبیعت میں تلخی کا عنصر مزید بڑھتا چلا گیا تھا۔ سلطان کی انتہائی سختی اور دباؤ کی پالیسی نے ہر خاص و عام کو سلطنت کا دشمن بنا دیا تھا۔ راجپوت ریاستوں کے سردار اور حکمران بھی سلطان کے خلاف ہو گئے تھے۔

دوست تو رہے ایک طرف، اس نے اپنی اولاد کے ساتھ بھی کبھی مشفقانہ رویہ روا نہ رکھا تھا اور ملک کافور کے کہنے میں آ کر ولی عہد شہزادہ خضر خان اور شہزادہ شادی خان کو گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔

ان حالات میں کون اس سے ہمدردی کر سکتا تھا؟

مگر نصرت خان کے دل میں اس کے لئے ہمدردی تھی۔ وہ اس کا سچا اور مخلص دوست تھا جبکہ سلطان کی وجہ سے ہی اس کی اکلوتی بیٹی اب تک کنواری بیٹھی تھی۔ امراء و نوابین کے باہمی اشتراک سے جنم لینی والی سازشوں اور بغاوتوں کے سدِ باب کے لئے سلطان نے یہ قانون نافذ کر دیا تھا کہ امراء و نوابین سلطان سے اجازت لئے بغیر باہمی طور پر رشتے ناتے نہیں کر سکتے...... نصرت خان نے زرنگار کا رشتہ اپنے چچیرے بھائی اظفر خان کے بیٹے سے طے کیا تھا۔ جب وہ شادی کی اجازت لینے سلطان کے پاس گیا تھا، تو اس نے دوستی اور تعلق کے رشتے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس رشتے کے لئے انکار کر دیا تھا۔

سلطان کے انکار سے نصرت خان کو بہت تکلیف ہوئی تھی مگر وہ آج بھی اس کا وفادار تھا اور اسے ایک غلام کی قید میں دیکھ کر غصے سے کھول گیا تھا۔

وہ انہی خیالوں میں گم، گھوڑا دوڑاتا اپنی حویلی تک پہنچ گیا۔

حویلی کی فصیل میں نصب لکڑی کا بڑا پھاٹک دربان نے اسے دیکھتے ہی کھول دیا تھا۔ وہ گھوڑے کو اسی طرح سرپٹ دوڑاتا رہائشی عمارت تک آ پہنچا۔ سائیس نے آگے بڑھ کر گھوڑا رکتے ہی اس کی لگام تھام لی اور نصرت خان کود کر نیچے آ گیا۔ ابھی اس نے اندر کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ احاطے کی دیوار پھاند کر ایک سیاہ تنومند شخص منہ میں خنجر دبائے، اس پر ٹوٹ پڑا۔

سائیس گھوڑا لے کر مڑا ہی تھا کہ پیچھے نصرت خان پر یہ ناگہانی آفت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ گھوڑا چھوڑ، چیختا ہوا، خنجر بردار شخص سے لپٹ گیا۔ اس کی چیخ و پکار سن کر پھاٹک پر متعین دربان اور حویلی کے اندر موجود خدام باہر نکل آئے۔

اس صورت حال نے قاتل کو پریشان کر دیا تھا۔ اس نے خنجر سے پے در پے اندھا دھند کئی وار کیئے اور سائیس کو دھکیلتا بجلی کی سرعت سے دوڑتا ہوا احاطے کی دیوار تک گیا اور اچھل کر دیوار پر چڑھ کر دوسری جانب کودا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

خدام، نصرت خان کو اٹھا کر قریبی کمرے میں لے آئے تھے۔ اس کے زخموں سے بری طرح خون رس رہا تھا۔

سراج بھاگا ہوا زنان خانے میں اطلاع دے گیا۔

"یا پروردگار......" فجستہ بی بی اور زرنگار بانو ایک ساتھ دہل کر بولی تھیں۔

"آپ ذرا اُدھر چلی چلئے اور خون روکنے کی کوئی تدبیر کیجئے، تب تک میں حکیم کو بلا کر لاتا ہوں۔" سراج نے کہا۔

"میں بھی چلوں گی۔" زرنگار نے روتے ہوئے کہا۔

"اُدھر سب لوگ جمع ہو گئے ہیں، وہاں مردانے میں آپ کیا کریں گی...... میں لحہ لحہ کی خبر آپ تک پہنچاتا رہوں گا۔" سراج نے اُسے سمجھایا اور فجستہ کو لئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ ہی دیر میں حکیم بھی پہنچ گیا تھا۔ گو کہ زخم زیادہ کاری نہ تھے مگر خون زیادہ بہہ جانے کے باعث نصرت خان پر غنودگی طاری ہو گئی تھی۔

کئی حکیم اور طبیب بلا لئے گئے تھے۔ نصرت خان کا چچیرا بھائی اظفر خان بھی آ موجود ہوا تھا۔ نصرت خان پر قاتلانہ حملے کی جسے خبر ملتی، وہ پرسانِ حال کو چلا آیا تھا۔ اسی لئے رات گئے تک زرنگار کو باپ کی صورت دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ لوگوں کی آمد و رفت کم ہوتے ہی فجستہ بی بی نے پردہ کروا کر زرنگار کو بلوالیا۔

نصرت خان بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔ خون رک گیا تھا، زخموں پر پٹیاں کس دی گئی تھیں مگر ہنوز وہ ہوش میں نہ تھا۔ اس کے سرخ وسفید چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور اَدھ کھلی آنکھوں سے نقاہت جھانک رہی تھی۔

"بابا جان......" زرنگار پٹی تھام کر زار و قطار رونے لگی۔

"خود کو سنبھالو ننھی بیگم۔" فجستہ نے اُسے گلے سے لگاتے ہوئے تسلی دی۔ "اللہ نے چاہا تو زخم چند دنوں میں بھر جائیں گے اور سرکار بالکل بھلے چنگے ہو جائیں گے۔"

"اتنے حکیم، طبیب جمع تھے...... پھر کیا وجہ ہے کہ بابا اب تک ہوش میں نہیں آئے؟" زرنگار نے سوال کیا۔

"خون زیادہ بہہ جانے کے باعث نقاہت اور کمزوری ہے۔" سراج نے آگے بڑھ کر وضاحت کی۔ "اور ویسے بھی سرکار اظفر خان نے فیصلہ کیا ہے کہ صبح سویرے ملک جونا خان کو بلوا لیا جائے گا۔"

"ہاں یہ بہت اچھا ہو گا۔" فجستہ بی بی نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ "میں تو کہتی ہوں، انہیں اسی وقت بلوا لینا چاہئے...... ان کی اہلیت اور قابلیت سے کسے انکار ہے۔"

☆......☆......☆

"تجھ نابکار سے اتنا سا کام بھی نہ ہو سکا۔" ٹھیک اسی لمحے قصر ہزار ستون کے ایک چھوٹے کمرے میں ملک کافور ایک سیاہ رنگ کے موٹے اور ٹھگنے غلام پر برس رہا تھا۔ "اپنے کام میں مہارت کا تجھے اس قدر دعویٰ ہے اور تو اتنا معمولی سا کام بھی نہ کر سکا۔"

"سرکار کیا کرتا، گھڑی کی چوتھائی میں سائیس مجھ سے آ چپٹا تھا، شور شرابہ سن کر خدام کی ایک فوج نکل آئی تھی...... پھر بھی میں نے حتی الوسع کام مکمل کرنے کی کوشش کی...... مگر......" غلام نے سر جھکا کر دھیمے اور شرمسار لہجے میں وضاحت کی۔

"وہ زندہ بچ گیا...... اب کیا کیا جائے؟" ملک کافور نے ہاتھ ملتے ہوئے زیر لب کہا۔

"جو حکیم علاج کیلئے بلایا گیا ہے، اس سے ساز باز کر کے......" غلام نے مشورہ دینا چاہا مگر ملک کافور کو اپنی جانب گھورتے دیکھ کر درمیان میں ہی رک گیا۔

"جانتے بھی ہو، اس کے علاج معالجے کے لئے کل صبح ملک جونا خان کو بلوایا جا رہا ہے۔"

"تو سرکار...... میں ابھی جا کر جونا خان سے مل لیتا ہوں۔" غلام نے جلدی سے کہا۔

"تو جونا خان کو نہیں جانتا۔" ملک کافور نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "اُسے خریدا نہیں جا سکتا۔"

"تو کچھ ڈرا دھمکا کر......" غلام کی بات پر ملک کافور کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

"وہ ملک غازی کا بیٹا ہے...... اُس دلیر باپ کے بیٹے کو ڈرا دھمکا کر کام نہیں نکالا جا سکتا۔"

"تت...... تو پھر......" غلام نے متوحش لہجے میں سوال کیا۔

"تو...... یہ کہ اب ہمیں اپنے منصوبے پر جلد از جلد عمل پیرا ہو جانا چاہئے۔" ملک کافور نے کہا۔ پھر اس غلام کے پیچھے سر جھکائے ہوئے اپنے خاص ساتھی بسم اللہ کو مخاطب کر کے کہا۔ "وصیت نامہ کہاں ہے؟"

"تیار ہے...... آپ کا حکم ہو تو لے آؤں؟" اس نے جلدی سے جواب دیا۔

"ہاں، فوراً لے آؤ...... اس سے قبل کہ امراء و وزراء کی حمیت بیدار ہو، ہمیں سلطان علاء الدین خلجی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلا دینا چاہئے۔"

"جو آپ مناسب سمجھیں، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" اس نے دھیمے مگر پُرجوش لہجے میں جواب دیا اور تیزی سے کمرے سے نکل کر وصیت نامہ لانے چلا گیا۔

☆......☆......☆

ملک کافور وصیت نامہ لئے سلطان کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔ سلطان اس وقت نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا۔ ملک کافور نے اپنے ساتھی کی مدد سے اسے تکیوں کے سہارے بٹھاتے ہوئے مخاطب کیا۔

"سلطان معظم، اس کاغذ پر...... دستخط کر دیجئے......"

"یہ کیا ہے؟" سلطان نے نیم وا آنکھوں سے کاغذ کی طرف دیکھا۔

"اس بات کو جانے دیجئے، بس آپ دستخط کر دیجئے......" اب کے ملک کافور کے لہجے میں ایک تلخی اور ناگواری تھی۔ سلطان نے ذرا سی پلکیں کھول کر ملک کافور کی طرف دیکھا۔ سلطان کو شل وجت میں مبتلا دیکھ کر وہ لپک کر سلطان کے پہلو میں آ بیٹھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی دستخط کروا دیئے۔

دستخط ہوتے ہی ملک کافور نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔ "سلطان معظم کی وہ خاص دوا لے آؤ...... جسے پی کر سرکار کو ہمیشہ کے لئے قرار آ جائے۔"

"جی بہتر......" وہ لپک کر ایک پیالہ لے آیا، جس کے اندر ہلکے سبز رنگ کا کوئی مشروب تھا۔

"اس وقت...... نن...... نہیں۔" سلطان نے نفی میں سر ہلاتے لڑکھڑاتی آواز میں مشروب پینے سے انکار کرنا چاہا مگر ملک کافور اور اس کے ساتھی نے زبردستی پکڑ کر مشروب سلطان کے حلق میں انڈیل دیا۔

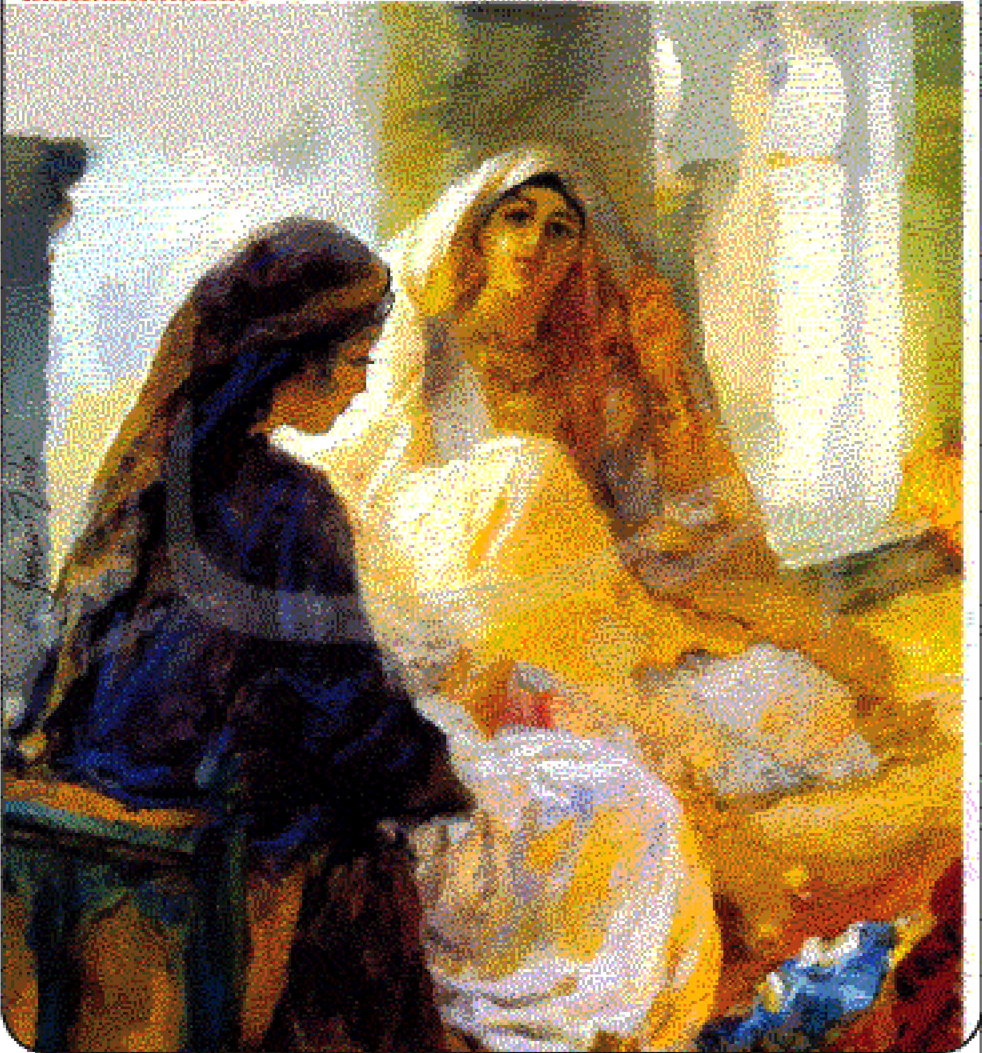
مشروب کے حلق سے اُترتے ہی سلطان پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا تھا اور چند لمحوں بعد ہی، اس کا سر ایک جانب لڑھک گیا۔

(جاری ہے)

سلطان محمد تغلق

اشتیاق قاطر علی

قسط : 5



چرخِ نیل فام پر گھر گھر کر سیاہ بادل جمع ہو رہے تھے۔ کبھی بادلوں کی اوٹ سے چاند کا کملایا ہوا چہرہ جھانکنے لگتا تو، دلی کے سنسان و ویران کوچہ و بازار میں ملگجا سا اُجالا پھیل جاتا۔ اگلے ہی لمحے بدلی کا کوئی اور ٹکڑا آگے بڑھ کر سہمے ہوئے چاند کو اپنی آغوش میں لے لیتا تو ہر سو، شب کی وحشت انگیز سیاہیاں بکھر جاتیں۔

شاہی قصر کے پہلو میں واقع، شاہی محلے کے حویلی نما شاندار مکانات ساکت و جامد کھڑے، خاموش نظروں سے آکاش پر ہوتی چاند اور بادلوں کی آنکھ مچولی دیکھ رہے تھے۔

شاہی قصر کی پچھلی جانب، نواب نصرت خان کی اونچی حویلی، رات کے ان سناٹوں میں، سکوت کا لبادہ اوڑھے، افسردہ و دل گرفتہ کھڑی تھی۔ کل رات اس گھر کے مالک پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا...... اور اگلی صبح جونا خان کو طلب کر لیا گیا تھا۔

کشادہ خواب گاہ کے دریچے نیم وا تھے، جن سے ہوا کے ہلکے جھونکے شریر بچوں کی طرح اندر جھانکتے، دل چاہتا تو دریچے پھاند کر اندر چلے آتے، دل نہ چاہتا تو باہر کے باہر رخصت ہو جاتے۔ کمرے کے وسط میں بچھی کشادہ اور آرام دہ مسہری پر نصرت خان آنکھیں بند کئے بے سدھ پڑا تھا۔ اس کے سرخ و سفید توانا چہرے پر اس وقت پژمردگی اور زردی چھائی ہوئی تھی۔ پپڑی زدہ خشک لب باہم پیوست تھے اور الجھے ہوئے بال بے ترتیب سے شفاف پیشانی پر جھکے ہوئے تھے۔

اس کے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھا جونا خان افسردہ اور پُرسوچ نظروں سے اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ اُسے آج صبح فجر کے وقت جوں ہی نصرت خان کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی، وہ فوری طور پر یہاں آ گیا تھا...... اور آتے ہی اس نے پٹیاں اُتروا کر ایک خاص انداز سے زخموں پر لیپ کر کے دوبارہ پٹیاں باندھ دی تھیں، جس کے باعث خون کا رستا تھم گیا تھا۔

جونا خان کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھا بوڑھا شاہی حکیم احسن خان دہلوی خاموش نظروں سے جونا خان کی کارروائیاں دیکھ رہا تھا۔

جونا خان جب سے آیا تھا مختلف نسخہ جات مریض پر آزما رہا تھا۔ پتھر کے کھرل میں سراج تواتر سے مختلف جڑی بوٹیاں اور اجزاء کھرل کر رہا تھا، جنہیں خجستہ بی بی بصد مشکل نصرت خان کے حلق سے نیچے اُتار رہی تھی۔

گوکہ خون کا رستا اب بند ہو چکا تھا مگر کل رات سے اب تک اس کے جسم سے اس قدر خون ضائع ہو چکا تھا کہ اب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کی رگوں میں لہو نام کی کوئی چیز موجود ہی نہ ہو اور یہی بات جونا خان کے لئے پریشانی کا باعث تھی۔ خون کی انتہائی قلت جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"سرکار، بفضل تعالیٰ ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟" صبح سے اب تک کئی بار کیا جانے والا سوال، خجستہ بی بی نے اس وقت پھر دہرایا۔ جونا خان مریض کی دگرگوں حالت اور خستہ حالی میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ ہر بار کی طرح اس بار بھی وہ بوڑھی انا کی آواز نہ سن سکا۔

دبیز پردے کے پیچھے کھڑی زرنگار بانو مضطرب دل اور پریشان نظروں سے پردوں کے بیچ کی جھری سے کبھی باپ کا پژمردہ چہرہ اور کبھی جونا خان کی پُرتشویش صورت دیکھ رہی تھی۔

آج کتنے عرصے بعد اس نے جونا خان کو دیکھا تھا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو یقیناً اس کی پیاسی نگاہیں اپنے مطلوب و مقصود کی بلائیں لیتیں اور بے قرار دھڑکنیں مسرت و انبساط کی لے پر دیوانہ وار رقص کرتیں مگر تقدیر اس کے محبوب کو اس کے سامنے اُس وقت لائی تھی جب اس کا عزیز از جان باپ موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا بستر پر بے سدھ پڑا تھا۔

کل رات سے رو رو کر اس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ گلاب جیسا چہرہ کملا گیا تھا۔ لمبے سیاہ گھنے بالوں کی اُلجھی لٹیں چہرے کے اطراف اور پشت پر بکھری ہوئی تھیں۔ شکن آلود لباس اس کی بے خوابی اور بے آرامی کی داستان سنا رہا تھا۔ بھیگی پلکوں، نم آنکھوں اور خشک لبوں سے وہ بارگاہِ رب العزت میں اپنے بابا جان کی زندگی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ خدا کی رحمتوں کے بعد اسے جونا خان کی صلاحیتوں پر بھروسا تھا۔ صبح دم جب سے جونا خان نے آکر اس کے باپ کی مسیحائی کے فرائض سنبھالے تھے۔ اس کے تڑپتے، بلکتے دل کو بے وجہ ہی قرار سا آ گیا تھا۔ جانے کیوں اُسے یقین تھا کہ جونا خان اپنے زورِ مسیحائی سے اس کے باپ کی زندگی کے بجھتے چراغ میں پھر سے روشنی بھر دے گا۔ وہ پُرامید اور پُریقین نگاہوں سے اپنے مسیحا کی اور تکے جا رہی تھی۔

مگر مسیحا خود اس وقت حیران و پریشان بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ مسیحائی کا کون سا ہنر آزمائے کہ جس کے طفیل اس لب دم مریض کو حیاتِ نو مل سکے۔

جونا خان کے وجیہہ چہرے پر سوچ کی لکیریں گہری ہوتی دیکھ کر زرنگار کی دھڑکنوں میں عجب سا اضطراب جاگنے لگا۔

ابھی چند لمحوں قبل خجستہ بی بی نے اس سے مریض کے بارے میں سوال کیا تھا۔ زرنگار مسیحا کے جواب کی منتظر تھی مگر اس کی طرف سے جواب کی بجائے اذیت ناک خاموشی کا دورانیہ بڑھا تو زرنگار کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"طبیبِ محترم۔" اس کے خشک لبوں سے مُردہ سی آواز برآمد ہوئی۔ "براہ کرم بتایئے بابا جان...... ٹھیک تو ہو جائیں گے؟"

جونا خان نے بے ساختہ چونک کر پردے کی سمت دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے نگاہیں دوبارہ مریض پر مرکوز کر دیں۔

"اللہ پر بھروسا رکھئے...... ہر چیز اس کے اختیار میں ہے۔" جونا خان کو خود اپنی آواز اجنبی محسوس ہو رہی تھی اور اپنے ادا کئے الفاظ بے اعتبار اور بے وقعت سے لگ رہے تھے۔ "انشاء اللہ، نواب صاحب ضرور ٹھیک ہو جائیں گے۔"

"ننھی بیگم، اپنے کمرے میں چل کر کچھ دیر آرام کر لیجئے۔" خجستہ بی بی نے پردے کے اُس پار جا کر زرنگار بانو کو شانوں سے تھامتے ہوئے، رقت بھری آواز میں کہا۔ "کل رات سے یہ وقت آ گیا...... اب تک ایک کھیل بھی اُڑ کر تمہارے منہ میں نہیں گئی...... دو گھونٹ دودھ ہی پی لو۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو، انا بی؟" زرنگار نے حیرت بھری ناگواری سے جواب دیا۔ "یہاں بابا جان بسترِ علالت پر پڑے ہیں، میں کس منہ سے کھاؤں اور کس دل سے آرام کروں۔"

"بڑے حکیم صاحب موجود ہیں، جونا خان موجود ہیں۔ اُن پر تو تمہیں بہت اعتبار ہے نا...... بس اب میرا کہا مان لو اور گھڑی بھر کو اپنے کمرے میں چل کر آرام کر لو۔"

خجستہ بی بی کے بے حد اصرار اور سراج اور بڑے حکیم احسن خان دہلوی کے کہنے پر آخر وہ اندر جانے کے لئے رضامند ہو گئی۔ بادل نخواستہ وہ اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئی مگر دل کو کسی کروٹ قرار نہ تھا...... عجب سے خدشوں اور وسوسوں نے اُسے چاروں طرف سے گھیرا ہوا تھا۔

شام کے سرمئی سائے دھیرے دھیرے رات کی سیاہی میں گھلنے لگے تھے۔

جونا خان فجر کے وقت سے نصرت خان کے تنِ مردہ میں زندگی کی رمق جگانے کے لئے اپنی سی کوششوں میں لگا ہوا تھا۔ اس دوران وہ صرف فرض نمازوں کی ادائیگی کے لئے قریبی مسجد تک گیا تھا اور خجستہ بی بی اور سراج کے اصرار کے باوجود صبح سے اب تک اس نے کھانے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلتے تھکن کے گمبھیر سایوں کو دیکھ کر بڑے حکیم صاحب نے مشفق لہجے میں اُسے مشورہ دیا۔ "صبح سے رات ہو گئی۔ جونا خان، بہتر ہوگا کہ اب آپ اپنے گھر تشریف لے جایئے اور کچھ دیر آرام کر لیجئے۔"

"مگر......" جونا خان نے کوئی تاویل پیش کرنی چاہی۔

"آپ جو کچھ کر سکتے تھے، وہ سب کر لیا...... اب نواب صاحب کی طبیعت قدرے بہتر ہے، آپ بے فکر ہو کر جایئے...... میں یہیں موجود ہوں۔"

"سرکار نے صبح سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں...... حکم ہو تو خوان لگا دوں؟" خجستہ بی بی کو جونا خان کی بھوک پیاس کا احساس رہ رہ کر کلسا رہا تھا۔ وہ جھٹ سے بولی۔ "سرکار، دو لقمے توڑ لیجئے...... اس لونڈی کے دل کو قرار آ جائے گا۔"

"نہیں...... ابھی اشتہا نہیں ہے۔" جونا خان نے دھیمے اور سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ "البتہ قبلہ حکیم صاحب کے مشورے کے بموجب کچھ دیر کے لئے گھر جانا چاہتا ہوں، صبح دم پھر حاضر ہو جاؤں گا۔" پھر وہ حکیم احسن خان کی طرف متوجہ ہو کر مودب لہجے میں بولا۔ "آپ کے ہوتے فکر کی بات تو نہیں ہے مگر آپ اگر اس ناچیز کی ضرورت محسوس کریں تو رات کے کسی بھی پہر بلا تکلف بلوا بھیجئے گا۔"

"جیتے رہیئے۔" بوڑھے حکیم نے مشفق لہجے میں جواب دیا۔ "غازی ملک یقیناً خوش قسمت ہیں، جو آپ جیسے صاحبزادے کے والد ہیں۔"

جونا خان خدا حافظ کہتا اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اپنے گھوڑے پر سوار اپنے گھر کی طرف جاتا ہوا جونا خان، نصرت خان سے اپنی کل کی ملاقات اور اس ملاقات میں کی گئی باتوں کے بارے میں سوچ رہا تھا...... اور پھر جانے کیسے اس کی سوچ کی رو زرنگار بانو کی طرف بہہ نکلی۔

اُدھر اپنے بستر پر لیٹی زرنگار بھی اسی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ صبح سے رات گئے تک وہ جس ہمدردی، جانفشانی، محبت اور لگن سے نصرت خان کی صحت یابی کے لئے کوشاں تھا، اس کے اس پُرخلوص اور بے لوث عمل نے زرنگار کی نگاہوں میں اس کی عزت و تکریم کچھ اور بڑھا دی تھی۔

☆......☆......☆

شاہی قصر شام کے سرمئی دھندلکوں میں افسردہ و دل گرفتہ کھڑا تھا۔ دُکھ کے بارگراں سے بوجھل جھونکوں میں سسکیاں پوشیدہ تھیں۔ در و دیوار سے اُداسی اور ویرانی ٹپک رہی تھی۔ دربار کے لئے وقف طویل ایوان میں اس وقت موت کا سا سکوت طاری تھا۔ درباری سر جھکائے خاموش و رنجیدہ کھڑے تھے۔ یاقوت و زمرد سے سجا تخت اس وقت خالی تھا۔ اس تخت پر جلوہ گر ہونے والا سلطان علاء الدین خلجی اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور تمام امراء و وزراء اس سانحے پر ماتم کرنے اور اظہارِ تعزیت کیلئے یہاں جمع تھے۔ دارالحکومت میں موجود وزراء و امراء کے علاوہ قریب و دور کے سب ہی پرگنوں اور صوبوں کے والی و کماندار بھی پہنچ چکے تھے۔

دیپال پور کا کماندار غازی ملک اپنے جواں سال صاحبزادے جونا خان اور نوعمر بھتیجے فیروز خان کے ساتھ سر جھکائے رنجور کھڑا تھا۔ جونا خان کے جواں اور دلکش چہرے پر بھی فکر و تردد اور ملال کی پرچھائیاں لرزاں تھیں۔ ایک طرف تو وہ ملک نصرت خان کی پُرتشویش حالت کی طرف سے پریشان تھا تو دوسری طرف سلطان کی اچانک موت کے بعد ملک میں پیدا ہونے والی صورت حال سے ہراساں تھا۔

وہ عظیم فرمانروا کہ جس نے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ تقدیر کے لکھے نے اُس کو صفحۂ ہستی سے یک جنبشِ قلم، حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔

اتنا بڑا سانحہ وقوع پذیر ہوا تھا مگر کوئی قیامت بپا ہوئی تھی، نہ کوئی بھونچال آیا تھا، نہ گزرتے لمحوں کے قدم ڈگمگائے تھے، نہ متحرک ساعتوں کی نبضیں تھمی تھیں...... وقت کا کارواں جوں کا توں رواں دواں تھا...... بس میرِ کارواں تھک کر سو گیا تھا۔ اپنوں کی کج ادائیوں اور لاپرواہیوں سے عاجز ہو کر اس نے ملک کافور کو اپنا مان کر اپنا سب کچھ اسے سونپ دیا تھا...... اور اُسی سنگ دل و دغا باز شخص نے دوست بن کر اس کی پیٹھ میں خنجر پیوست کیا تھا اور اس کی رگوں میں زہر ہلاہل اُتار دیا تھا...... اور یوں خلجی اپنے شاہانہ جاہ و جلال، خسروانہ شان و شوکت کو بھول کر کسی بھی ایک عام آدمی کی طرح آنکھیں بند کر کے ابدی نیند سو گیا تھا۔

دربار میں موجود سب ہی لوگ افسردہ و غم زدہ ملک کافور کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد نائب ملک (وزیراعظم) ملک کافور اپنے قریبی ساتھیوں خان کوچک، ہجرت خان اور خسرو ملک کے ساتھ دربار میں داخل ہوا۔ اُس نے سیاہ ماتمی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور اس کے چہرے سے ویرانی ٹپک رہی تھی۔

دربار میں داخل ہو کر اس نے ایک نگاہ حزن و ملال کی تصویر بنے، سر جھکائے درباریوں پر ڈالی تھی، پھر آہستگی سے چلتا تخت کے چبوترے پر جا کھڑا ہوا۔

"جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، میرے منہ میں خاک...... سلطانِ معظم علاء الدین خلجی اس دارِ فانی سے رخصت ہو چکے ہیں۔" اس کی غم واندوہ میں ڈوبی آواز اُبھری۔

"افسوس...... افسوس......" اس کے لحظہ بھر کو تھمتے ہی درباریوں نے ماتم کے سے انداز میں سینے پر ہاتھ مار کر اظہارِ تعزیت کیا۔

"سلطانِ معظم کو سپردِ خاک کرنے سے پہلے تخت و تاج کے وارث کا تعین ضروری ہے۔" اس نے درباریوں کے اظہارِ تعزیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس وقت میرے ہاتھ میں سلطانِ معظم کا نیا وصیت نامہ ہے۔"

اُس نے ہاتھ میں پکڑی ایک دستاویز کو لہرا کر اپنے سامنے پھیلاتے ہوئے ایک طائرانہ نگاہ درباریوں پر ڈالی۔ وہ سب آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لئے اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"اس نئے وصیت نامے کی رو سے سلطان مرحوم نے اپنے بڑے صاحبزادے خضر خان کو ولی عہدی سے معزول کر کے سب سے چھوٹے شاہزادے عمر خان کو ولی عہد مقرر کیا ہے۔"

ان جملوں کے ادا ہوتے ہی پورے دربار میں بے چینی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کئی درباریوں نے مضطرب انداز میں پہلو بدلا اور کچھ نے مشکوک اور معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

"اس وصیت نامے پر سلطان مرحوم کے دستخط اور شاہی مہر موجود ہے۔ میں قابلِ احترام درباریوں کی خدمت میں یہ وصیت نامہ ملاحظہ کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔"

دربار میں یکبارگی بھنبھناہٹ سی جاگ اٹھی۔ ملک کافور کے اشارے پر خان کوچک نے وصیت نامہ قریب ترین کھڑے درباری کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس نے وصیت نامے پر ایک نگاہ ڈال کر اُسے آگے بڑھا دیا۔ سب ہی جانتے تھے یہ وصیت نامہ جعلی ہے۔ ملک کافور نے اس وصیت پر زبردستی یا دھوکے سے سلطان کے دستخط کروائے ہیں مگر کوئی بھی اس حقیقت کو زبان پر لانے کی جرأت نہ رکھتا تھا۔

وصیت نامہ درباریوں کے ہاتھوں میں سفر کرتا جب غازی ملک کے ہاتھ میں پہنچا تو لحظہ بھر کو ملک کافور کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا تھا۔ وہ غازی ملک کی بہادری و شجاعت اور حق گوئی سے واقف تھا مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ غیاث الدین تغلق غازی ملک کو بلاوجہ دوسروں کی باتوں میں رخنہ اندازی کی عادت نہیں ہے۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے کا عادی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ملک کافور خلجی کے تمام گورنروں میں غازی ملک کو پسند کرتا تھا اور اس کی عزت بھی کرتا تھا یا شاید اس کی شجاعت و طاقت سے خائف رہتا تھا کہ اس سے ہمیشہ ہی بنا کر رکھنا چاہتا تھا۔ خود غیاث الدین تغلق، غازی ملک کو بھی بے سبب ملک کافور سے چپقلش مول لینے کی ضرورت نہ تھی، اسی لئے وصیت نامے پر ایک نگاہ ڈال کر اُس نے وہ وصیت نامہ اپنے پہلو میں کھڑے اپنے بیٹے جونا خان کی طرف بڑھا دیا۔

وصیت نامے پر نگاہ ڈالتے ہی جونا خان کی پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔ کوئی بھی ذی شعور انسان یہ بات تسلیم نہیں کر سکتا تھا کہ سلطان خلجی نے اپنے تین جواں سال بیٹے نظر انداز کر کے پانچ سالہ کمسن اور نابالغ بیٹے کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ غازی ملک نے اپنے ذہین بیٹے کی کشمکش کو محسوس کرتے ہوئے آہستگی سے اس کے ہاتھ سے وصیت نامہ لے کر اپنے ساتھ کھڑے بوڑھے وزیر ملک اسماعیل کے حوالے کر دیا۔

وصیت کے مطابق فیصلہ تو طے تھا۔ اب بس اس فیصلے پر عمل پیرا ہونا باقی تھا۔ سو شام ہونے سے قبل نوعمر شاہزادے عمر خان کو شہاب الدین محمد عمر خان خلجی کے القاب کے ساتھ تخت نشین کر کے اس کے سر پر تاجِ دہلی رکھ دیا گیا۔

ملک کافور پہلے سے ہی نائب ملک یعنی وزیراعظم کے عہدے پر فائز تھا، اس لئے بظاہر تاج تو عمر خان کے سر پر تھا مگر عملی طور پر عنانِ حکومت ملک کافور کے ہاتھ میں تھی۔

یہ بے انصافی خلجی کے منجھلے شاہزادے مبارک شاہ کے لئے ناقابلِ قبول تھی۔

"بابا جان کے وفادارو...... نمک خوارو، کیا ہو گیا ہے تم لوگوں کو؟" اس نے درباریوں کو غیرت دلاتے ہوئے دہائی دی۔ "خضر خان اور شادی خان گوالیار کے قلعے میں نظربند ہیں...... مگر میں تو یہاں موجود ہوں...... کمسن عمر خان کی نسبت میں حکومت کا زیادہ حق دار ہوں...... آپ لوگوں کو میرے حق کی خاطر آواز بلند کرنی چاہئے۔"

"شاہزادے، سلطان مرحوم نے وصیت نامے میں عمر خان کے حق میں فیصلہ دے کر...... دیگر تمام شاہزادوں کو حکومت کے حق سے محروم کر دیا ہے۔" بوڑھے امیر، ملک اسماعیل نے دھیمی اور مجبور آواز میں جواب دیا۔

"اور آپ سب میرے حق کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ وصیت نامہ جعلی ہے۔" مبارک شاہ نے طیش بھری آواز میں کہا۔

"وصیت نامہ جعلی ہو سکتا ہے...... مگر سلطان کے دستخط اور مہر اصلی ہے۔" ملک اسماعیل کی بات نے مبارک شاہ کا منہ بند کر دیا تھا مگر ملک کافور کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ اس کے جاسوسوں نے یہ گفتگو اس تک پہنچا دی تھی اور اس نے فوری طور پر مرحوم سلطان کی وصیت پر شک کرنے اور اُسے جعلی قرار دینے کے جرم کی پاداش میں مبارک شاہ کو گرفتار کروا کر زندان میں ڈال دیا تھا۔

"اب آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا؟" رات کو ایوانِ خاص میں چوسر کی بازی کے دوران خان کوچک نے ملک کافور سے سوال کیا تھا۔

"سب سے پہلے گوالیار میں قید دونوں بڑے شاہزادوں کے آنکھوں کے دیئے بجھانے ہیں کیونکہ جب تک ان کی آنکھوں میں روشنی رہے گی، وہ تخت و تاج کے حصول کے خواب دیکھتے رہیں گے۔"

اور اگلے ہی دن ملک کافور نے اپنے گرگے بھیج کر خضر خان اور شادی خان کی آنکھوں میں دہکتی ہوئی سلائیاں پھروا کر انہیں ہمیشہ کے لئے اندھا کروا دیا۔ اب ملک کافور کی حکومت کے لئے کوئی خطرہ باقی نہ رہا تھا۔ خضر خان اور شادی خان نابینا ہو چکے تھے۔ مبارک شاہ زندان میں پڑا قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہا تھا۔

وہ ہفتے میں دو دن دربار لگاتا تھا۔ عمر خان کو حرم سے بلا کر تخت پر بٹھاتا اور کچھ دیر بعد اُسے اس کی ماں کے پاس حرم میں واپس بھیج دیتا۔ گوکہ تخت پر عمر خان بیٹھتا تھا مگر درحقیقت حکومت کی باگ ڈور ملک کافور کے ہاتھ میں تھی...... حکومت پر اپنی گرفت مزید مضبوط کرنے کی خاطر اس نے عمر خان کی ماں دلکشا بانو سے عقد کر لیا اور بڑی ملکہ، ملکہ جہاں کی ساری جائیداد اور دولت ضبط کر کے اپنے تسلط میں لے لی...... ان تمام امراء کو کہ جنہیں وہ اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا تھا، اس نے معزول کر دیا۔

مگر غیاث الدین تغلق غازی ملک کو دیپال پور کی کمانداری اور ملک جونا خان کو امیر آخور کے عہدوں پر فائز رکھا گیا تھا مگر غازی ملک نے مناسب یہی سمجھا کہ دیپال پور جاتے وقت وہ جونا خان اور فیروز کو اپنے ساتھ لیتا جائے۔ اس سلسلے میں اس نے ملک کافور سے اجازت بھی لے لی تھی۔

"مگر بابا جان...... یہاں...... سب......" جونا خان نے کچھ پس و پیش کا مظاہرہ کیا۔

"تمہیں یہاں کے حالات کا اندازہ نہیں ہے جونا خان۔" غازی ملک نے دھیمی آواز اور سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تمہارا یہاں سے دور رہنا ہی بہتر ہے...... رہا سوال تمہاری ملازمت کا تو میں نے ملک کافور سے بات کر لی ہے...... تم بے فکر ہو کر گھر چل سکتے ہو۔"

''ملازمت کے علاوہ......کچھ مریض میرے زیرِ علاج ہیں۔'' جونا خان نے دھیمی آواز میں تاویل پیش کی اور ساتھ ہی اُس کی نگاہ میں نصرت خان کا چہرہ گھوم گیا۔

''اگر تمہارا اشارہ ملک نصرت خان کی طرف ہے......تو آج دوپہر



میں خود اس کی عیادت کو گیا تھا۔'' غازی ملک نے گہری سانس لے کر بتایا۔ ''اس کی حالت کچھ بہتر ہے......احسن خان اور ملک طوسی جیسے بڑے اطباء اس کا علاج کر رہے ہیں۔ تمہارے یہاں ہونے یا نہ ہونے سے اُسے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ شفا تو من جانب اللہ ہے۔''

تب ہی بالکل اچانک، جونا خان کے سوچ کے پردے پر زرنگار بانو کا اُداس چہرہ اور بھیگی آنکھیں اُبھر آئی تھیں......وہ اس کے لئے اور اس کے بابا کے لئے کچھ بھی نہ کر سکا تھا......اور کرنا بھی چاہتا تو بھلا کیا کر سکتا تھا؟

نصرت خان کو شفا دینا اس کے اختیار میں نہ تھا......اور زرنگار کی خاموش آنکھوں میں مچلتے سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''اب کیا سوچ رہے ہو، جا کر آخری بار نصرت خان کو دیکھ آؤ......اور چلنے کی تیاری کرو......ویسے بھی بہت دنوں سے تم اپنی ماں اور بہن سے نہیں ملے ہو، وہ دونوں تم کو بہت یاد کرتی ہیں۔ یوں اچانک تمہیں سامنے پا کر وہ بہت خوش ہوں گی۔''

ماں اور بہن کے ذکر نے جونا خان کو بالآخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔

اور دیپال پور روانہ ہونے سے قبل اُس شام وہ آخری بار نصرت خان کو دیکھنے گیا تھا۔ ہمیشہ کی طرح فیروز خان بھی اس کے ساتھ تھا۔

''سنا ہے آپ اپنے والد کے ساتھ دیپال پور جا رہے ہیں؟'' بوڑھے حکیم احسن خان نے سوال کیا۔

''جی، والد صاحب کی یہی منشاء ہے۔'' جونا خان کے جواب پر پردے کے پیچھے موجود زرنگار کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

''واپسی کب تک ہوگی؟'' احسن خان نے مزید پوچھا۔

''اب دیکھئے......کچھ کہہ نہیں سکتے...... دوبارہ آنا ہو......یا نہ ہو......''

''ٹھیک کہتے ہیں......یہ شہر اب شرفاء کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔'' احسن خان نے جواب دیا......مگر زرنگار اس کی بات سن نہ سکی کیونکہ وہ تو جونا خان کا جواب سن کر ہی سن ہو گئی تھی......اپنی جگہ جم سی گئی تھی اور جونا خان جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ساتھ ہی فیروز بھی کھڑا ہو گیا تھا۔

''سنیئے......'' جب وہ دالان کی سیڑھیاں اُتر رہا تھا، تب محرابی دروں کے اونچے ستونوں میں سے ایک کے پیچھے سے زرنگار کی دھیمی اور مترنم آواز نے اس کے بڑھتے قدم روک لئے۔

''آپ نے جانے کا فیصلہ کرنے سے پہلے بابا جان کے بارے میں سوچا ہوتا......وہ صرف آپ کے سہارے زندہ ہیں۔''

زرنگار ستون کے آڑ میں تھی مگر اس کی، دیدار کی پیاسی آنکھیں جونا خان کے دل نواز چہرے پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''سہارا تو صرف خدا کی ذات کا ہوتا ہے۔'' جونا خان نے جواب دیا۔ ''اور جہاں تک نواب صاحب کے علاج کا تعلق ہے تو ان کے پاس احسن خان جیسے دانا معالج موجود ہیں، ویسے بھی شفا اوپر والے کے ہاتھ میں ہے، ایک میرے نہ ہونے سے ان کے لئے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''اور اس حرماں نصیب کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' زرنگار نے سسکی سی لی۔ ''کیا آپ اب تک نہیں سمجھ سکے کہ آپ اس ناچیز کے لئے کیا ہیں؟''

''اس طرح کی باتیں آپ کو زیب نہیں دیتیں۔'' جونا خان نے رُخ موڑ کر نا خوشگوار لہجے میں جواب دیا۔

''مجھے آپ کی نصیحت کی نہیں......جواب کی ضرورت ہے؟'' زرنگار نے تنک کر کہا۔

''آپ کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے......ویسے بھی اپنے فیصلے کرنے پر میں خود......قادر نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر جونا خان نے روانگی کے لئے قدم بڑھا دیئے۔

''اگر آپ کا یہی جواب ہے......تو پھر میرا فیصلہ بھی سنتے جایئے۔'' زرنگار مرمر کے وسیع قطر والے ستون کی آڑ سے نکل کر ایک دم جونا خان کے سامنے چلی آئی۔ جونا خان نے بے ساختہ نگاہیں اٹھائیں۔

کرب و اذیت اور پریشانیوں کے غبار میں لپٹی ہونے کے باوجود اُس کا حسن اب بھی لاجواب تھا۔ اُس کے کنوارے جسد سے اٹھتی دلفریب مہک نے جونا خان کو مسحور کر دیا تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا......وہ اپنی جگہ ساکت اور بے خود سا اُسے تکے جا رہا تھا۔

''یہ چہرہ صرف آپ کے سامنے بے نقاب ہوا ہے۔'' اپنے چہرے پر ٹکی اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے زرنگار نے دھیمے مگر سچے لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''اب کفن میں ملفوف ہونے تک یہ چہرہ صرف آپ کی امانت ہے......اس دل کا دروازہ پہلی بار صرف آپ کے لئے کھلا ہے......اور مرتے دم تک یہ آپ کے لئے کھلا رہے گا......آپ لوٹ کر آئیں نہ آئیں......میں آپ کی راہ تکتی رہوں گی......آپ قبول کریں نہ کریں، میں نے دل و جان سے آپ کو اپنا سب کچھ مان لیا ہے......اب اس گھر اور اس دل میں کوئی اور نہیں آ سکتا......میں مرتے دم تک آپ کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔''

جونا خان سے کئی سیڑھیاں نیچے اُتر جانے والے فیروز نے پلٹ کر جونا خان کی طرف دیکھا تھا۔ وہ زرنگار کو تو نہیں دیکھ سکا تھا مگر اس کی جذبوں سے گندھی مترنم اور مدھر آواز اس کی سماعتوں تک پہنچ رہی تھی......وہ چودہ سال کا نوعمر لڑکا تھا، اس لئے تمام باتوں کا مفہوم تو نہیں سمجھ سکا تھا مگر اس نے ہر ہر بات، بہت غور سے سنی تھی۔

تب ہی نیچے سے گھوڑے کی ہنہناہٹ سنائی دی تھی۔ ان دونوں کو دالان کی سیڑھیاں اُترتے دیکھ کر سائیس اُن کا گھوڑا آگے لے آیا تھا۔ آواز سنتے ہی جونا خان جیسے ہوش میں آ گیا تھا۔ زرنگار بھی ایک دم سے ستون کی آڑ میں چلی گئی تھی......اور وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا فیروز خان کے قریب چلا آیا تھا۔ فیروز خان چہرے پر حیرت اور آنکھوں میں سوال لئے اس کی سمت تکے جا رہا تھا۔

''بھائی جان......اوپر......کون تھا......میرا مطلب ہے، کون تھی؟'' اس نے حیرت اور معصومیت سے سوال کیا۔

''گھوڑا اِدھر لے آؤ۔'' جونا خان نے فیروز کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پیشانی پر پھوٹ آنے والے پسینے کو صاف کیا اور سائیس کو مخاطب کر کے گھوڑا اس جانب لانے کا حکم صادر کیا۔ فیروز، بھائی کے ایک ایک انداز سے واقف تھا، سمجھ گیا کہ وہ جواب دینا نہیں چاہ رہا چنانچہ وہ خاموشی سے بھائی کے پیچھے چل دیا۔ جواب گھوڑے کی پشت پر سوار ہو چکا تھا۔ فیروز بھی جست لگا کر اس کے پیچھے جا بیٹھا۔ گھوڑے کے مڑنے تک فیروز نے ایک بار دالان کی سیڑھیوں کے اوپر نگاہ کی تھی، تب ہی اُسے دو اشکبار آنکھیں اور ایک مایوس اور اُداس چہرہ دکھائی دے گیا تھا وہ حیرت سے اس چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں کو تکتا رہا تھا۔

فیروز کا خیال تھا کہ جونا خان بھی شاید پلٹ کر دیکھے گا مگر اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ جونا خان پلٹے بنا، گھوڑا سرپٹ دوڑاتا نکلا چلا گیا۔

گھر پہنچ کر بھی کئی دن تک فیروز کے ذہن پر وہ آنکھیں، وہ چہرہ چھایا رہا۔ اس نے کئی بار جونا خان کی آنکھوں میں بھی وہ چہرہ ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی مگر اسے وہاں ایک کامل سکوت اور ایک بے رحم بے حسی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔

ان دونوں کے گھر لوٹ آنے کی وجہ سے پورے گھر میں خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی تھی۔ مخدومہ جہاں اور بی بی کدبانو اپنے اپنے بیٹوں کی واپسی پر بے حد خوش تھیں تو ننھی خداوندزادہ بھائیوں کی آمد پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔

''آپ نے یہ بہت ہی اچھا کیا جو دونوں لڑکوں کو بھی ساتھ لے آئے۔'' کل سے اب تک مخدومہ جہاں یہ بات کئی بار غیاث الدین تغلق غازی ملک سے کہہ چکی تھی اور یہ بات کہتے وقت اس کے لہجے میں تشکر کا احساس گھل جاتا تھا۔ ''ان حالات میں جونا خان وہاں رہتا تو میں بلاوجہ پریشان رہتی۔''

''مانا کہ تم جونا خان کی ماں ہو۔'' آخرکار غازی ملک جواب دینے پر مجبور ہو گیا۔ ''مگر یہ مت بھولو......میں بھی اس کا باپ ہوں اور وہ مجھے بھی اُسی قدر عزیز ہے جس قدر تمہیں پیارا ہے......میں وہاں کے حالات کی وجہ سے نہیں، اس کی غصیلی اور ضدی طبیعت کی وجہ سے اپنے ساتھ لایا ہوں، اگر کسی وجہ سے وہ غصے یا ضد میں آ جاتا تو بلاوجہ دوسروں کے لئے مشکلیں کھڑی کر دیتا......اور جہاں تک حالات کا تعلق ہے، مرد بچے حالات کی سختیوں سے نہیں گھبراتے۔ زندگی جنگ کرنے، مشکلات پر غالب آنے اور فاتح کی طرح جینے کا دوسرا نام ہے۔ یہی زندہ رہنے کا حقیقی اصول ہے۔ وہ آسان زندگی جس میں سب کچھ بغیر کشمکش کے مل جائے، جمادات اور نباتات کی زندگی ہے۔''

''آپ لوگ بھی کیا باتیں لے بیٹھے۔'' بی بی کدبانو مسکراتی ہوئی گفتگو میں شریک ہوئی......''ایک عرصہ ہو گیا، اس گھر میں خوشی کے شادیانے نہیں بجے......میں تو کہتی ہوں......بھابی جان......بس اب جلدی سے جونا خان کی شادی کر دیجئے۔''

''مشورہ تو بُرا نہیں۔'' مخدومہ جہاں نے مسکرا کر تائید طلب نگاہوں سے غازی ملک کی طرف دیکھا۔ ''آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں نے پہلے بھی آپ کی کسی بات سے اختلاف کرنے کی گستاخی کی ہے؟'' غازی ملک کی بات پر کدبانو تو بے ساختہ ہنس پڑی تھی اور مخدومہ جہاں کے رخساروں پر سرخی چھلک آئی تھی اور وہ شرما کر وہاں سے اُٹھ گئی۔

جونا خان تک جب یہ بات پہنچی تھی تو وہ بڑا حیران ہوا۔

''کمال ہے......شادی بیاہ کا یہ کون سا وقت ہے؟''

''کیا مطلب؟'' اب کے مخدومہ جہاں کے حیران ہونے کی باری تھی۔ ''خیر سے تم بیس برس کے ہونے کو آئے ہو......یہی تو وقت ہوتا ہے شادی بیاہ کا۔''

''میں اپنی عمر کی نہیں، ملکی حالات کا ذکر کر رہا تھا......آپ دیکھ رہی ہیں اُدھر دلی میں کیا ہو رہا ہے اور ہم یوں لاتعلق ہو کر شادی کے شادیانے بجانے بیٹھ جائیں......یہ کہاں کی عقلمندی ہے۔''

''کیا آپ کی شادی دلی میں ہوگی؟'' فیروز خان نے بے ساختہ سوال کیا اور اس کے ذہن کے پردے پر وہ اُداس آنکھیں اور مایوس چہرہ اُبھر آیا تھا۔

''یہ سوال تمہارے ذہن میں کیوں آیا؟'' بی بی کدبانو نے چونک کر بیٹے سے سوال کیا۔

''کیونکہ وہاں دلی میں......ایک حویلی کے دالان میں......'' فیروز خان نے جواب دینا شروع ہی کیا تھا کہ جونا خان نے گھبرا کر پلٹ کر اس کی جانب دیکھا......تو وہ بولتے بولتے ایک دم خاموش ہو گیا۔

''بولو نا، وہاں......حویلی میں......دالان میں......کیا تھا؟'' کدبانو کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

''چچی جان......آپ بھی کہاں بچے کی بات سننے لگیں۔'' جونا خان نے سٹپٹاتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی۔ ''میرا خیال ہے......اس گھر میں سب سے پہلے اس گھر کی اکلوتی بیٹی کی شادی ہونی چاہئے یعنی خداوندزادہ کی......میری خواہش ہے کہ اس کی شادی اس دھوم دھام سے ہو کہ لوگ برسوں یاد رکھیں۔''

''اللہ تمہاری زبان مبارک کرے۔'' مخدومہ جہاں نے دور کھیلتی ہوئی ننھی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جب وہ وقت آئے گا تو ایسا ہی کر لینا مگر ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ اس کی شادی کے لئے ابھی کئی سال درکار ہیں......ابھی تو صرف اور صرف تمہاری شادی کی بات ہو سکتی ہے۔''

''مگر امی جان......ابھی میں شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا......ابھی میرے کرنے کے لئے بہت سے ضروری کام ہیں......شادی کے بندھنوں میں اُلجھ کر میں وہ کام ادھورے نہیں چھوڑ سکتا۔''

مخدومہ جہاں خاموش ہو گئی۔ اُسے جونا خان میں اپنے دیور رجب کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ بھی شادی کے نام پر یوں ہی بدکتا تھا کیونکہ اس کے دل و دماغ میں ایک انجان حسینہ کی تصویر بجی تھی۔

تو کیا جونا خان بھی کسی خیالی پیکر کے عشق میں گرفتار ہے؟ اُس نے پریشان نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا......اور اگر ایسا ہوا تو رجب کی طرح جونا خان کی شادی کے سلسلے میں بھی بہت مشکلوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسری طرف جونا خان سوچ رہا تھا۔ ایسا لگتا ہے فیروز خان نے زرنگار کی باتیں سن لی ہیں اور شاید اُسے دیکھ بھی لیا ہے......اگر ایسا ہے تو......یہ تو بہت ہی برا ہوگا۔ مجھے فیروز کو سمجھا کر زبان بند رکھنے کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

اور نوعمر معصوم فیروز سوچ رہا تھا۔ وہ لڑکی کتنی خوبصورت تھی اور اس کی آواز کس قدر دلکش تھی۔ بھائی جان کو کسی نہ کسی لڑکی سے تو شادی کرنی ہے، تو پھر وہ اسی سے کیوں نہیں کر لیتے......جو کہہ رہی تھی......بھلا کیا کہہ رہی تھی وہ؟ فیروز دیر تک اُس کی باتیں یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر ایک جملے کے سوا اسے کچھ یاد نہیں آیا تھا۔ ''اس دل میں اور اس گھر میں آپ کے سوا کوئی دوسرا نہیں آئے گا۔ میں مرتے دم تک آپ کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔''

☆......☆......☆

شہر دہلی پر سیاہ رات سایہ فگن تھی۔ کوچہ و بازار سنسان و ویران تاریکی کی آغوش میں دبکے پڑے تھے، ہر سمت ہُو کا عالم تھا، کبھی کبھی ہواؤں کی سسکیاں سی اُبھرتیں اور تناور درخت لرز کر ماتم کرنے لگتے اور ہواؤں کے تھمتے ہی پھر دم سادھ کر ساکت ہو جاتے۔

قصر ہزار ستون پر ملک کافور کے ہزاروں ستم جاری تھے۔ ملکہ جہاں کی تمام دولت و جائیداد ضبط کر کے اُسے زندان میں ڈال دیا گیا تھا۔ دونوں بڑے شاہ زادے خضر خان اور شادی خان پہلے ہی بینائی سے محروم ہونے کے بعد زندان کی تاریک کوٹھریوں میں قید تھے۔ ملکہ دلکشا سے نکاح کے بعد ملک کافور بادشاہ وقت عمر خان کا سوتیلا باپ بن بیٹھا تھا۔ گو کہ تخت پر عمر خان تھا مگر ہندوستان کا اصل بادشاہ ملک کافور ہی تھا۔ تمام احکام و فرامین وہ خود جاری کرتا تھا۔ اس نے بڑے بڑے عہدوں پر اپنے وفادار ہندوؤں کو فائز کر دیا تھا۔ اب اس کی آنکھوں میں سترہ سالہ شاہ زادہ مبارک شاہ بُری طرح کھٹکنے لگا تھا۔ وہ قید میں ہونے کے باوجود اس کے خلاف آواز بلند کرتا رہتا تھا۔ اس کی ماں بی بی ماہک بھی بیٹے کے لئے راہ ہموار کرنے میں لگی رہتی تھی۔ ملک کافور کے لئے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا......چنانچہ اس نے قصر ہزار ستون کے دو محافظوں کرک اور مجیب کو بلا کر شاہ زادے مبارک شاہ کے قتل کے لئے آمادہ کیا۔

''سرکار، ان حالات میں شاہ زادے کا قتل شاید آپ کے حق میں اچھا نہ ثابت ہو۔'' خان کوچک نے دھیمے لہجے میں مشورہ دیا۔ ''بہتر ہوگا کہ قتل کی بجائے دہکتی سلائیوں سے اس کی بینائی ضائع کروا دی جائے۔''

''چلو یہی سہی۔'' ملک کافور نے محافظوں کی طرف دیکھ کر حکم صادر فرمایا۔

''آج رات تم لوگ قصر میں جا کر مبارک شاہ کی آنکھوں کو ہمیشہ کے لئے بینائی سے محروم کر دو۔''

''جو حکم سرکار۔'' محافظوں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا اور رات کے سناٹے میں دبے پاؤں چلتے، تاریکی کی آڑ لیتے شاہ زادے کے زندان خانے کی طرف چل دیئے۔

وہ بدنصیب آنکھوں پر بازو دھرے ٹھنڈے فرش پر لیٹا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر تڑپ کر اُٹھ بیٹھا۔ سامنے دونوں محافظ ہاتھ میں دہکتی سلائیاں لئے کھڑے تھے۔

''تم دونوں کیا مجھے اندھا کرنے کے ارادے سے آئے ہو؟'' مبارک شاہ نے وحشت زدہ لہجے میں سوال کیا۔ ''سنگ دلو، کیا بھول گئے، میں علاء الدین خلجی کا بیٹا ہوں۔ میں اسی قصر میں پیدا ہوا۔ تم لوگوں کے سامنے بڑا ہوا۔ اپنے عظیم سلطان علاء الدین کی نسل کہ جس کی حفاظت پر مامور تھے، اب اُسے ہی مٹانے پر تلے ہو......''

''شاہ زادے، خاموشی سے خود کو ہمارے حوالے کر دو تا کہ ہم تمہاری آنکھیں پھوڑ کر تمہیں اندھا کر سکیں، حجت و بحث کرو گے تو مجبوراً ہمیں تمہیں جان سے مارنا ہوگا۔'' مجیب نے ترش لہجے میں کہا۔

''شاہ زادہ بھی کہتے ہو اور اس شاہ کے ساتھ کہ تمام عمر جس کا نمک کھاتے رہے، نمک حرامی پر بھی تلے ہو......میں اُسی شاہ کا بیٹا ہوں......یہ دیکھو......'' مبارک شاہ نے اپنے گلے سے مرصع کلاوہ نکال کر ان کے سامنے ڈال دیا۔ ''یہ دیکھو، یہ تمہارے سلطان معظم کی نشانی ہے......بھول گئے اُس سلطان کو؟ اس کی اولاد کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہو۔ ایک غلام کے کہنے میں آ کر تم اپنی عاقبت خراب کر رہے ہو۔ اگر بادشاہ کی روح کے سامنے سرخرو ہونا چاہتے ہو تو یہ خنجر لے کر جاؤ اور اُس بدبخت ملک کافور کے سینے میں اُتار دو۔''

مبارک شاہ کے کلام نے محافظوں پر جادو کا سا اثر کیا تھا۔ وہ مرصع کلاوہ دیکھ کر کانپنے لگے۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے۔ وہ کافی دیر تک شاہ زادے کے سامنے ہاتھ جوڑے کھڑے رہے، پھر تیزی سے باہر نکل گئے۔ باہر نکل کر انہوں نے کچھ اور محافظوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ پھر سب نے مل کر ایک ایک کر کے قصر کے تمام دروازے بند کر دیئے اور خنجر اور تیر و تفنگ لئے ملک کافور کے کمرے کی طرف روانہ ہو گئے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' ہاتھوں میں برہنہ خنجر اور آنکھوں میں نفرت اور غصہ دیکھ کر ملک کافور لرز اٹھا تھا۔ ''تم لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟''

''پاگل تو ہم پہلے تھے، اب ہوش میں آئے ہیں۔'' مجیب آگے بڑھ کر بولا۔ ''پچھلے 35 دنوں سے تو خاندان علائی کو خاک میں ملانے میں لگا ہے اور ہم خاموش تماشائی بنے تیرا ظلم دیکھ رہے ہیں، اب ہماری آنکھیں کھل گئی ہیں، اب تیرے جبر و ظلم کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔'' یہ کہہ کر مجیب نے آگے بڑھ کر ملک کافور کا سر تن سے جدا کر دیا۔ دوسرے محافظوں نے خان کوچک سمیت دیگر اور ساتھیوں کو واصل جہنم کر دیا تھا......اور صرف 35 دنوں کی حکومت کے بعد ملک کافور کا قصہ تمام ہو گیا۔

ملک کافور کے قتل کے بعد امراء نے شاہ زادہ مبارک شاہ کو قید سے نکال کر نابالغ سلطان شہاب الدین عمر کا نائب مقرر کر دیا۔

مبارک شاہ نے چند دن تو برادرِ خورد کی نیابت کی۔ پھر کچھ امراء کو اپنے ساتھ ملا کر شہاب الدین عمر خان کی آنکھوں میں سلائیاں پھروا کر گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا، جہاں اس کے دونوں بڑے بھائی خضر خان اور شادی خان بینائی سے محروم ہونے کے بعد پہلے ہی سے قید و بند کی صعوبتیں جھیل رہے تھے۔

شہاب الدین عمر خان خلجی کی حکومت تین ماہ تین روز پر مشتمل تھی۔ اُسے تخت و تاج سے محروم کر کے مبارک شاہ......سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کے لقب سے تخت دہلی پر جلوہ افروز ہوا۔

مبارک شاہ کا ابتدائی دورِ حکومت امن سے گزرا۔

اس نے اپنے والد کے جاری کردہ تمام احکامات واپس لے لئے۔ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا۔ ضبط شدہ جاگیریں واپس کر دیں اور امراء و خواتین میں بے شمار تحائف و انعامات اور خطابات بانٹے اور ایک نائب خاص ملک شادی کو، کہ جسے علاء الدین نے پالا تھا، اپنے التفات سے سرفراز کر کے خسرو خان کا خطاب دیا اور اسے منصب وزارت پر فائز کیا۔

خسرو خان کی صحبت نے مبارک شاہ کو شراب نوشی اور عیاشی کی طرف راغب کر دیا تھا۔ اب اس کا کام صرف رقص و سرور کی محفلوں میں حاضری رہ گیا تھا۔ اس کا دربار مسخروں، طوائفوں اور بھانڈوں کا اڈہ بن گیا۔ رعایا بھی تقلید میں پیچھے نہ رہی، جیسا راجہ ویسی پرجا کے مصداق، ہر شخص بے حیائی اور عیش پرستی کے گرداب میں گھرتا چلا گیا اور کیقباد کا زمانہ پھر سے لوٹ آیا۔

انہی دنوں دیوگری کے والی رام دیو کے داماد ہرپال دیو نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ قطب الدین مبارک شاہ نے خسرو خان کے ساتھ مل کر دکن پر حملہ کر دیا اور ہرپال کو قتل کرنے کے بعد خسرو خان کو تلنگانہ اور مرور کی طرف روانہ کر دیا جہاں پر اُسے خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔

سلطان مبارک شاہ اپنے لشکر کے ساتھ فاتحانہ انداز میں دہلی کی جانب رواں دواں تھا۔ دہلی سے دس فرلانگ کے فاصلے پر رات سر پر آ جانے کے باعث روانگی موقوف کر کے خیمے نصب کر دیئے گئے۔ مبارک شاہ اپنے خیمے سے جب حرم کی طرف جا رہا تھا تو تب ہی ایک شخص ننگی تلوار لئے اس پر لپکا تھا۔ اس سے قبل کہ اس کی تلوار سلطان کا سر تن سے جدا کرتی، اس کے نمک خوار خادم نے پھرتی سے حملہ آور کو بے بس کر کے اس کی تلوار چھین لی تھی۔

حملہ آور سلطان مبارک شاہ کا چچیرا بھائی اسد الدین تھا اور سلطان کے قتل کی اس سازش میں اس کے بھائی خضر خان اور شادی خان بھی شامل تھے جو اس وقت گوالیار کے قلعے میں مقید تھے، سو سلطان مبارک شاہ نے اُسی وقت نہ صرف اسد الدین بلکہ اس کے اہل و عیال اور عزیز و اقارب جو زیادہ تر دہلی میں مقیم تھے، سب کے قتل کا حکم صادر کیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے تینوں بھائی خضر خان، شادی خان اور شہاب الدین عمر خان کے قتل کا بھی پروانہ جاری کر دیا۔

تینوں بھائیوں اور سازشی اسد الدین کے خاندان کے ایک ایک فرد کو قتل کر دیئے کے بعد اب اس کی بادشاہت کی طرف للچائی ہوئی نگاہ ڈالنے والا کوئی بھی باقی نہ بچا تھا۔ ہرپال دیو کی بغاوت کے بدترین انجام نے دیگر باغیوں کے دل میں بھی سلطان کا خوف بٹھا دیا تھا۔ اب سلطان مبارک شاہ کی مطلق العنان بادشاہت کے لئے کوئی خطرہ نہ تھا۔ طاقت، دولت اور شراب کی مستی نے اس کے دل و دماغ میں تکبر بھر دیا تھا۔ وہ خود کو سب سے برتر تصور کرنے لگا تھا۔ وہ حکومتی امور اور ملکی معاملات میں کسی کے بھی مشورے کو قبول کرنا تو در کنار، سننا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ اگر وہ کسی کی بات سنتا تھا تو وہ صرف خواجہ سرا خسرو خان تھا......وقت گزرنے کے ساتھ خسرو خان اس پر بے حد اثر انداز ہوتا جا رہا تھا اور رفتہ رفتہ تمام حکومتی امور خسرو خان کے ہاتھ میں آتے جا رہے تھے۔

یہ صورت حال امراء کے لئے تشویشناک تھی۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ خسرو خان سلطنت دہلی کے لئے دوسرا ملک کافور ثابت ہونے والا ہے۔

(جاری ہے)

سُلطان محمد تغلق

اشتیاق قاطر ملک

قسط : 6

آکاش کی نیلی جھیل میں کنول کی طرح تیرتا چاند اب کملانے کو تھا۔ ڈھلکتی رات کے ساتھ دمکتی چاندنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ شب بھر تیزی سے چلتی ہوائیں، اب تھک کر مدھم ہو گئی تھیں۔

لیکن قصر ہزار ستون کے سلطان کے ایوانِ خاص میں رات اب بھی پورے شباب پر تھی۔ بلوری فانوسوں میں جھلملاتی کافوری شمعیں اب بھی بڑی مستعدی سے روشنی بکھیر رہی تھیں۔ مخملیں غالیچوں کے فرش پر رقاصاؤں کے تھرکتے جسموں سے کسی تھکن کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ ذرا فاصلے پر چوکے پر گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھی مترنم آواز میں راگ الاپتی مغنیہ اور شیشے کے نازک پیمانوں میں چاندی کی منقش صراحیوں سے مے انڈیل کر پیش کرتی نوعمر نوخیز اور نازک اندام ساقنیں بے حد مستعد نظر آ رہی تھیں۔

سلطانِ ہند قطب الدین مبارک شاہ ایک کشادہ و دلکشا مسہری پر نرم مخملیں تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کے پہلو میں خسرو خان زنانہ لباس و زیورات سے آراستہ و پیراستہ تمام تر ناز و انداز کے ساتھ موجود تھا۔

''جب سے آپ نے دیول کو اپنے حرم میں شریک کیا ہے، اس ناچیز کو تو گویا بھول ہی گئے ہیں۔'' خسرو نے ایک ادا سے شکوہ کیا۔

''کیسی باتیں کرتے ہو خسرو؟'' مبارک شاہ نے اُسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم خود کو تو بھول سکتے ہیں مگر تمہیں نہیں......''

''بس چھوڑیے...... سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔'' خسرو بولا۔ ''ایک گزارش کی تھی، آپ نے کان ہی نہ دھرے۔''

''ہم شرمندہ ہیں تمہاری بات یاد نہ رکھ سکے...... تم گزارش مت کرو...... حکم کرو۔'' تب خسرو خان ناز بھرے انداز میں اس کے قریب کھسک آیا اور بولا۔ ''والئی گجرات ظفر خان نے بہت پر پُرزے نکالنے شروع کر دیے ہیں...... ہم چاہتے ہیں کہ اسے قرار واقعی سزا دے کر ہمارے برادر حسام الدین کو گجرات کا والی مقرر کر دیا جائے۔''

''آہ حسام الدین......'' سلطان نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں آہ بھر کر بولا۔ ''تم تو جانتے ہو، تمہاری طرح وہ بھی ہمیں عزیز ہے...... تمہاری غیر موجودگی میں وہی تو ہمارا دم ساز و ہم نشین ہوتا ہے۔''

''تو پھر حکم صادر کرنے میں یہ لیت و لعل کیوں؟'' خسرو خان نے مخمور نگاہوں سے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''لیت و لعل کیسا؟ ہم کل ہی حکم جاری کیے دیتے ہیں۔'' مبارک شاہ نے بازو پھیلا کر خسرو خان کو دیکھا۔ ''جو کچھ تم چاہو گے، وہی ہو گا۔''

اور اگلے ہی دن گجرات کے والی ظفر خان کو قتل کروا کر وہاں کی حکومت حسام الدین کو سونپ دی گئی۔ حسام الدین بھی خسرو خان کی طرح خواجہ سرا تھا، اس کا ماں جایا بھائی تھا اور اسی کی طرح مبارک شاہ کا منظورِ نظر تھا۔

ایک بار پھر حکومت سلطان کے ہاتھ سے پھسل کر ایک خواجہ سرا کے ہاتھ میں آ گئی تھی۔ خسرو خان نے بیس ہزار ہندو گجراتی دہلی میں بلا کر انہیں ملازمتیں دیں اور اوزار و ہتھیار سے لیس کیا۔ اس طرح دیگر قوموں سے کل ملا کر اس کے پاس چالیس ہزار کا لشکر جمع ہو گیا...... اور اب اس نے سلطان کا کام تمام کر کے خود سلطان بن بیٹھنے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے مگر عاقبت نااندیش سلطان اس کے خوابوں اور ارادوں سے بے خبر و بے نیاز اپنی راتیں رنگین اور دن شاداب بنانے میں مشغول تھا۔

گو کہ تخت پر مبارک شاہ تھا مگر عملاً حکومت خسرو خان کے ہاتھ میں تھی۔ تمام احکام و فرامین وہی جاری کرتا تھا، اس نے ہر اس امیر وزیر اور عہدیدار کو معزول کر دیا جسے وہ اپنی کامیابی کی راہ میں رکاوٹ محسوس کرتا تھا اور ان کی جگہ اس نے اپنے خاندان کے لوگوں کو فائز کر دیا تھا۔

مگر حیرت کی بات تھی کہ ملک کافور کی طرح خسرو خان نے بھی والئی دیپال پور غیاث الدین تغلق غازی ملک کو چھیڑنے کی جسارت نہ کی تھی۔ وہ جوں کا توں اپنے عہدے پر قائم تھا۔ اس کا بیٹا جونا خان، امیر آخور کے عہدے پر فائز تھا مگر علاء الدین کے انتقال کے بعد غازی ملک اسے اپنے ساتھ لے گیا تھا چنانچہ خسرو خان نے ایک پیغام کے ذریعے جونا خان سے استدعا کی تھی کہ وہ اپنی چھٹیاں منسوخ کر کے ملازمت پر حاضر ہو جائے۔

خود جونا خان گھر میں پڑے پڑے خاصا بیزار ہو چکا تھا حالانکہ اس نے اپنی تدریس و تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا، اس کے باوجود وہ دہلی جا کر ملازمت کو جاری رکھنے کا خواہشمند تھا۔

خسرو خان کا پیغام ملتے ہی غیاث الدین تغلق غازی ملک بھی سوچ میں ڈوب گیا۔ اپنا پہلوٹھی کا یہ بیٹا اُسے بے حد عزیز تھا، دوسرے وہ اُس کی ضدی اور غصیلی فطرت سے بھی واقف تھا۔ دوسری طرف یہ بات بھی اہم تھی کہ ایک طرف جبکہ خسرو خان بڑے بڑے عہدیداروں کو معزول کر رہا تھا، ایسے میں وہ جونا خان کو ملازمت پر حاضر ہونے کی گزارش کر رہا تھا۔ سو یہ بات کسی اعزاز سے کم نہ تھی...... اور پھر غازی ملک حکم حاکم کی اہمیت سے بھی واقف تھا، اسی لئے وہ اس بات کے حق میں تھا کہ جونا خان کو اپنی ملازمت پر لوٹ جانا چاہئے مگر دہلی کے حالات کے پیشِ نظر مخدومہ جہاں اپنے چہیتے لختِ جگر کو وہاں بھیجنے سے ہچکچا رہی تھی کیونکہ فیروز خان بھی جونا خان کے ہم رکاب ہوتا تھا، اسی لئے اس کی ماں بی بی کدبانو کو بھی خاصی پریشانی تھی اور اس کی پریشانی کو مدِنظر رکھتے ہوئے غازی ملک نے فیصلہ کیا تھا کہ اس بار جونا خان کے ساتھ فیروز نہیں جائے گا کیونکہ یہاں فیروز نے پڑھائی میں دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا، اس لئے جونا خان بھی یہی چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں رہ کر پڑھے۔

''میں آپ کے ساتھ چلوں گا بھائی جان۔'' فیروز تک یہ بات پہنچی تو وہ دوڑا ہوا جونا خان کے پاس پہنچا۔

جونا خان نے پیار بھرے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہاں تم محمود خان، بہرام خان اور ظفر خان کے ساتھ کھیلتے ہو، مولوی صاحب سے پڑھتے ہو، یہاں امی جان اور چچی جان بھی ہیں...... سب کے ساتھ تم زیادہ خوش رہو گے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہاں سب لوگ ہیں۔'' فیروز خان نے بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مگر وہاں دہلی میں آپ بالکل اکیلے ہوں گے...... آپ کے پاس بھی تو کسی کو ہونا چاہئے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

چھوٹے چچازاد بھائی کی اس بے لوث محبت پر جونا خان نے بے ساختہ اسے سینے سے لگا لیا تھا اور پھر اس کے اصرار کے سامنے آخر سب کو ہی جھکنا پڑا تھا۔ دو روز بعد جونا خان، فیروز خان کو ساتھ لئے دہلی کے لئے روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

رات ڈھلے وہ لوگ اپنے محلے میں داخل ہوئے تھے۔ نصرت خان کی حویلی کے سامنے سے گزرتے ہوئے لحظہ بھر کو جونا خان کے گھوڑے کی رفتار سست پڑی تھی۔

اندھیرے کی آغوش میں کٹی، اونچے برجوں والی حویلی تاریک اور خاموش، بھوتوں کا بسیرا لگ رہی تھی۔ لکڑی کا کشادہ داخلی پھاٹک بند تھا اور احاطے میں واقع باغیچہ اُجڑا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا...... لمحہ بھر کو جونا خان کا دل چاہا کہ وہ رک کر کسی سے نصرت خان کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرے مگر رات کے اس پہر اسے یہ نامناسب سی بات محسوس ہوئی اور وہ اپنی سوچ کو رد کرتا آگے بڑھ گیا تھا۔

گھوڑے کی رفتار کم ہوتے ہی فیروز خان نے حویلی کی سمت دیکھا اور اس کی نگاہیں تاریکی میں سفر کرتی وسیع احاطے کے اُس پار مرمر کے ستونوں سے گھرے اس دالان پر جا ٹھہری تھیں، جہاں کچھ عرصے قبل سیڑھیاں اُترتے وقت اس کی سماعت سے ایک مترنم کرب بھری آواز ٹکرائی تھی اور ایک رنجور و ملول چہرہ نگاہوں کی حصار میں آیا تھا۔

فیروز خان کو حویلی کی سمت بغور دیکھتے، دیکھ کر جونا خان کو ایک بار پھر وہی گمان ہوا تھا کہ فیروز خان نے شاید اس شام زرنگار کو دیکھا اور اس کی باتیں سنی ہیں۔ کئی بار اس کے دل میں آیا کہ وہ فیروز کو یہ بات کسی سے کہنے سے منع کر دے مگر ہر بار وہ محض سوچ کر رہ گیا تھا، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں زرنگار کے لئے کوئی جذبہ، کوئی احساس نہ تھا، اسی لئے کوئی چور بھی نہ تھا۔

اُن دونوں کے اپنی رہائش گاہ پر پہنچتے ہی خدام بیدار ہو گئے تھے...... خواب گاہ کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ دونوں کے منہ ہاتھ دھو کر دسترخوان پہنچنے تک کھانا چن دیا گیا تھا۔ اس کا خاص خادم جب خان پنکھا لئے قریب آ بیٹھا تھا اور وہ دونوں کھانے میں مشغول ہو گئے تھے۔

''اب نواب نصرت خان کی طبیعت کیسی ہے؟'' فجر کی نماز کی ادائیگی کے بعد وہ فیروز خان کا ہاتھ تھامے مسجد سے باہر نکلا ہی تھا کہ حکیم احسن خان سے ملاقات ہو گئی۔ احسن خان اسے گلے لگا کر بے حد تپاک سے ملا۔ وہ اس کے والد غیاث الدین تغلق غازی ملک کا پرانا رفیق تھا۔ اس حوالے سے بھی وہ جونا خان سے اپنائیت سے پیش آتا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ جونا خان کی لیاقت و قابلیت سے بے حد متاثر تھا۔ علیک سلیک کے بعد بالکل اچانک ہی جونا خان کو نصرت خان کا خیال آیا تھا اور اس نے بے ساختہ سوال کر دیا تھا۔

''نواب نصرت خان؟'' حکیم احسن خان کے چہرے پر افسوس بکھر گیا۔ ''وہ تو آپ کے جانے کے چند روز بعد ہی اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔''

''اناللہ......'' جونا خان نے بے ساختہ کہا۔ نصرت خان کی موت کی خبر سن کر اسے افسوس ہوا تھا۔

احسن خان نے مزید بتایا۔ ''کیونکہ ان کے کوئی بیٹا نہ تھا، اس لئے ان کے مرتے ہی ملک کافور نے ان کی تمام جائداد اور جاگیر بحق سرکار ضبط کر لی تھی...... سب درباریوں کے بے حد گزارش کرنے پر فقط وہ حویلی جس میں ان کی بیٹی کی رہائش ہے، اس کی شادی ہونے تک اس کے پاس رہنے دی ہے۔''

''اوہ......'' جونا خان کے لب پُرتشویش انداز میں سمٹ گئے۔

''آج دربار میں خسرو خان کو اپنی آمد کی اطلاع دو گے؟'' احسن خان نے بات پلٹتے ہوئے سوال کیا۔

''جی، آج سلطان معظم مبارک شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ہے۔'' جونا خان نے خسرو خان کے ذکر کو نظرانداز کرتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں سلطان تو وہی ہیں مگر سلطنت کی باگ ڈور اسی بدکار خسرو خان کے ہاتھ میں ہے۔''

جونا خان نے احسن خان کے زیرِلب دل جلے انداز میں کیے گئے تبصرے پر کوئی تبصرہ نہ کیا اور ان سے اجازت لے کر گھر کے لئے روانہ ہو گیا۔

''جب خان، تم نے بتایا ہی نہیں کہ نصرت خان کا انتقال ہو چکا ہے؟'' ناشتے کے دوران اس نے اپنے باتونی خدمت گار جب خان سے شکوہ کیا تھا۔

''آہ سرکار! کیا بتاتا...... وہ تو گھر ہی اجڑ گیا...... وہ خستہ حال حویلی بھی اس وقت تک صاحبزادی کے پاس ہے جب تک کہ ان کی شادی نہیں ہو جاتی۔''

''شادی؟'' جونا خان نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''کیا ان کی شادی اب تک نہیں ہوئی؟''

''کہاں؟ نصرت خان نے اپنے برادرِ نسبتی کے صاحبزادے سے رشتہ طے کیا تھا مگر علاء الدین خلجی کے باہمی رشتوں پر پابندی کے باعث وہ رشتہ از خود ختم ہو گیا تھا...... اس کے بعد سے تو جانے انہیں کیا ہوا...... ان کا خادم سراج بتا رہا تھا...... اب تو وہ شادی کا نام بھی سننے کو تیار نہیں۔''

تب ہی فیروز خان کے کانوں میں ایک جملے کی بازگشت گونجی تھی۔ ''میں تمام عمر صرف آپ کے نام پر بیٹھی رہوں گی۔''

☆......☆......☆

دربار میں جونا خان نے سلطان مبارک شاہ کی خدمت میں اپنی حاضری کا رقعہ پیش کیا۔

''ہمیں خوشی ہے کہ تم ملازمت پر حاضر ہو گئے ہو۔'' خسرو خان نے اسے سرتاپا تحسین آمیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تم جیسے ہی دانا اور توانا جوانوں کی ضرورت ہے۔''

خسرو خان کی نگاہوں نے جونا خان کو ایک کراہیت آمیز احساس سے دوچار کر دیا تھا اور اس نے ٹھیک اسی لمحے اب کبھی دوبارہ دربار میں حاضر نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دن بہ دن دربار کا حال بھی بد سے بدتر ہوتا جا رہا تھا۔ خسرو خان، سلطان کے مزاج میں اس قدر دخیل ہو گیا تھا کہ وہ اسی کے انداز میں بات کرنے لگا تھا۔ دربار میں جو زبان کھولتا، اس کے ساتھ انتہائی بدتہذیبی اور بدتمیزی سے پیش آتا...... حتیٰ کہ دشنام طرازی سے بھی پرہیز نہ کرتا۔

ذرا ذرا سی بات پر لوگوں کے سر قلم کروا دیتا۔ ان حالات سے عاجز ہو کر حاکم دکن ملک یک لکھی نے بغاوت کر دی تھی۔ سلطان نے بغاوت کچلنے کے لئے لشکر روانہ کیا...... سپاہی ملک لکھی کو گرفتار کر کے دہلی لائے۔ سلطان نے اس کے ناک کان کٹوا دیے، اس کے بیوی بچوں سمیت دیگر ساتھیوں کو بھی بعد از عقوبت موت کے گھاٹ اتار دیا۔

ان حالات میں جونا خان کا دہلی میں رہنا ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے تمام حالات سے اپنے باپ غازی ملک کو آگاہ کیا تو اس نے واپس دیپال پور آنے کا حکم دے دیا۔

☆......☆......☆

ہر سمت شام کے سرمئی سائے بکھرے تھے۔ سبک خرام ہواؤں میں ایک بے نام سی خنکی سمائی ہوئی تھی جو سلگتے ذہن اور تپتے بدن کو ایک عجب سی تازگی اور راحت بخش رہی تھی۔ گو کہ باغیچہ ویرانے میں بدل چکا تھا مگر مہندی کی باڑھ اب بھی موجود تھی...... اور زرنگار بانو اسی کے داہنی جانب پڑی لکڑی کی سال خوردہ بینچ پر بیٹھی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی خمار آلود آنکھوں میں اداسی اور دلکش کتابی چہرے پر ملال کی کیفیت منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔

''کچھ سنا تم نے ننھی بیگم...... یہ سراج کیا کہہ رہا ہے؟'' خجستہ بی بی تیز تیز چلتی قریب چلی آئی تھی۔

زرنگار نے منہ سے کچھ نہیں کہا، بس سوالیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''یہ سراج بتا رہا ہے کہ اسے جب خان نے بتایا ہے کہ جونا خان مستقل طور پر دیپال پور جانے کا ارادہ باندھ رہے ہیں۔''

''وہ یہاں رہیں یا دیپال پور...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے اتا بی۔'' زرنگار نے ایک حسرت بھری آہ بھر کر جواب دیا۔

''ہم نے تم سے لاکھ بار کہا...... انہیں کوئی پیغام ہی بھیج دو، سراج یا ہمارے ذریعے کوئی بات کہلوا دو...... مگر تم......'' خجستہ بی بی نے ماتھے کو چھو کر ہاتھ جھٹکا۔

''مجھے جو کہنا تھا، میں انہیں کہہ چکی۔'' زرنگار نے دور خلا میں کسی غیر مرئی نکتے پر نگاہ مرتکز کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں اپنا فیصلہ انہیں سنا چکی...... اب جواب دینے کی ان کی باری ہے...... وہ جواب دیں نا دیں، کوئی فیصلہ کریں نا کریں...... اب اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''ننھی بیگم...... اب تمہیں ہم کیسے سمجھائیں؟'' خجستہ بی بی نے بے بسی سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آخر یہ پہاڑ سی زندگی اس طرح کیونکر کٹے گی۔''

زرنگار نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ خاموشی سے اُٹھ کر زنان خانے کی طرف چل دی تھی۔

☆......☆......☆

نیلا آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بادلوں کی سیاہی کے باعث رات کی تاریکی کچھ اور گہری ہو گئی تھی۔ ہواؤں کے تیز جھکڑ اونچے تناور درختوں کو چھیڑتے گزر رہے تھے، کبھی جو ہوا تھم جاتی تو ہر سمت سناٹا پھیل جاتا۔

مبارک شاہ اپنی خواب گاہ میں بستر پر نیم دراز تھا اور خسرو خان پیمانے بھر بھر کر اس کی خدمت میں پیش کر رہا تھا۔ آج وہ عجب سی بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ خود خسرو خان بھی کچھ مضطرب اور بے کل سا تھا۔ کل رات ہی اس نے سلطان سے قصر کی چابیاں حاصل کی تھیں اور اب کسی بھی پل اس کے ساتھی ان چابیوں سے محل کے دروازے کھول کر اندر داخل ہوا چاہتے تھے۔

داخلے کے وقت دربانوں نے انہیں اندر آنے سے روکنے کی کوشش کی تو ایک شور سا بپا ہوا۔ قاضی ضیاء الدین جو قصر کے دربانوں کا نگران اعلیٰ تھا، اپنے ساتھی لے کر دوڑا۔ خسرو خان کے چچا نے تلوار کے ایک وار سے قاضی ضیاء کا سر تن سے جدا کر دیا...... دیگر محافظ لپکے تو خسرو خان کے گرگوں نے تلواریں سونت لیں اور محافظوں کو تہ تیغ کرتے محل میں داخل ہو گئے۔

''یہ شور کیسا ہے؟'' مبارک شاہ نے خمار آلود آنکھوں سے چاروں طرف گھبرا کر دیکھتے ہوئے خسرو خان سے سوال کیا۔

''ابھی دیکھتا ہوں۔'' خسرو خان تیزی سے بالکونی کی جانب لپکا اور چند لمحوں بعد آ کر اسے بتایا۔ ''کچھ گھوڑے اصطبل سے نکل کر بھاگ کھڑے ہوئے ہیں، سائیس انہی کو پکڑنے کی تگ و دو میں مشغول ہیں، اسی لئے شور ہو رہا ہے۔''

اس اثناء میں خسرو خان کے خاص گرگوں ابراہیم اور اسحاق نے محل خاص کے دربانوں کو قتل کیا اور سلطان کی خواب گاہ کی طرف چلے...... شور و غوغا سن کر سلطان کے کان کھڑے ہوئے اور وہ تیزی سے بستر سے اُترا اور حرم کی طرف لپکا۔ خسرو خان تیزی سے اس کے پیچھے دوڑا اور اسے بالوں سے پکڑ کر زمین پر گرا لیا، تب ہی اس کے ساتھی بھی پہنچ گئے۔ اسحاق نے ایک ضربِ شمشیر سے سلطان کا کام تمام کیا اور اس تاجدار کا سر جو سزاوارِ تاج تھا، تن سے جدا کر کے قصر ہزار ستون کی بالکونی سے نیچے پھینک دیا۔

خسرو خان اپنے بھائی حسام الدین، چچا مندل اور دیگر ساتھیوں سمیت حرم میں داخل ہوا۔ علاء الدین خلجی کی بیگمات کو قتل کیا۔ سلطان مبارک شاہ کے کمسن بیٹوں فرید خان، علی خان اور عمر خان کو تہ تیغ کیا اور اس کے حرم کی بیگمات کے ساتھ زیادتی کا بازار گرم کیا۔

ابھی صبح کاذب کا دھندلکا پوری طرح پھیلا نہ تھا، اس لئے خسرو خان نے خدام کو جھاڑ فانوس اور مشعلیں روشن کرنے کا حکم دیا اور اپنے آدمی امراء و وزراء کو بلانے کے لئے دوڑائے۔

عین الملک ملتانی جو کہ ان دنوں دیوگڑھ سے آیا تھا۔ وجیہہ الدین قریشی اور قراء بیگ اور جونا خان اور دیگر امراء کو فوری طور پر طلب کیا گیا تھا اور صبح کا اجالا پوری طرح پھیلنے سے قبل خسرو خان ''نصیر الدین خسرو شاہ'' کے لقب سے تختِ دہلی پر سلطانِ دہلی کی حیثیت سے سر پہ تاج زرنگار رکھ کر متمکن ہوا۔ اپنے تخت کے دونوں جانب اس نے عین الملک ملتانی اور ملک جونا خان کو ایستادہ کیا تھا۔

علاء الدین خلجی کے غلاموں کو کہ جن کی تعداد لاکھوں میں تھی، قتل کروا کر ان کی عورتیں اور بیٹیاں خسرو خان کے لشکر میں بانٹ دی گئیں۔ اس نے اپنے بھائی حسام الدین کو خان خاناں کا خطاب دے کر علاء الدین کی بیٹی اسے بخش دی اور قطب الدین مبارک شاہ کی منکوحہ دیول سے خود نکاح کر لیا۔

اس نے اپنے رفیقوں کے لئے خزانے کے منہ کھول دیے تھے اور اپنے لشکر کو چھ ماہ کی پیشگی تنخواہیں عطا کیں، جاگیریں اور زمینیں تقسیم ہوئیں اور گوہر و جواہر لٹائے گئے۔

کچھ امراء پر بھی اس نے خصوصی عنایات کی تھیں۔ عین الملک ملتانی کو امیر الامراء بنا دیا تھا، ملک وجیہہ الدین کو تاج الملک کا خطاب عطا کیا اور جونا خان کا عہدہ بڑھا کر زرِ خطیر اس کی خدمت میں پیش کیا تاکہ اس کا باپ غازی ملک ان عنایات سے مرعوب ہو کر اس کی اطاعت کرے۔

مگر جونا خان کے لئے یہ سب ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ غصے سے بل کھاتا تھا اور خون کے گھونٹ پی کر جیتا تھا۔ اس نے تمام حالات سے غازی ملک کو آگاہ کر دیا تھا۔ وہ بھی یہ تمام واقعات سن کر غصے سے آگ بگولا ہو اٹھا تھا۔ باپ کی اجازت پا کر ایک رات جونا خان، فیروز خان اور چند ساتھیوں کے ساتھ دیپال پور کے لئے روانہ ہو گیا۔

صبح دم جب خسرو خان کو جونا خان کی روانگی کا علم ہوا تو وہ غصے سے چراغ پا ہو اٹھا۔ ''شائستہ خان، فوراً ایک دستہ لے کر جونا خان کے تعاقب میں جاؤ اور اس نمک حرام کو گرفتار کر کے ہمارے حضور میں پیش کرو۔''

مگر شاید اب دیر ہو چکی تھی۔ شائستہ خان تعاقب میں روانہ ہوا مگر جونا خان کی گرد کو بھی نہ پا سکا اور ناکام واپس لوٹ آیا۔

☆......☆......☆

جونا خان، فیروز خان اور چند وفادار ساتھیوں سمیت پہلے قلعہ سرتی پہنچا۔ وہاں غازی ملک نے پہلے سے ہی دو سوار بیٹے کے انتظار میں متعین کیے ہوئے تھے۔ جونا خان ان سواروں کو ساتھ لئے آخرش دیپال پور پہنچ گیا۔

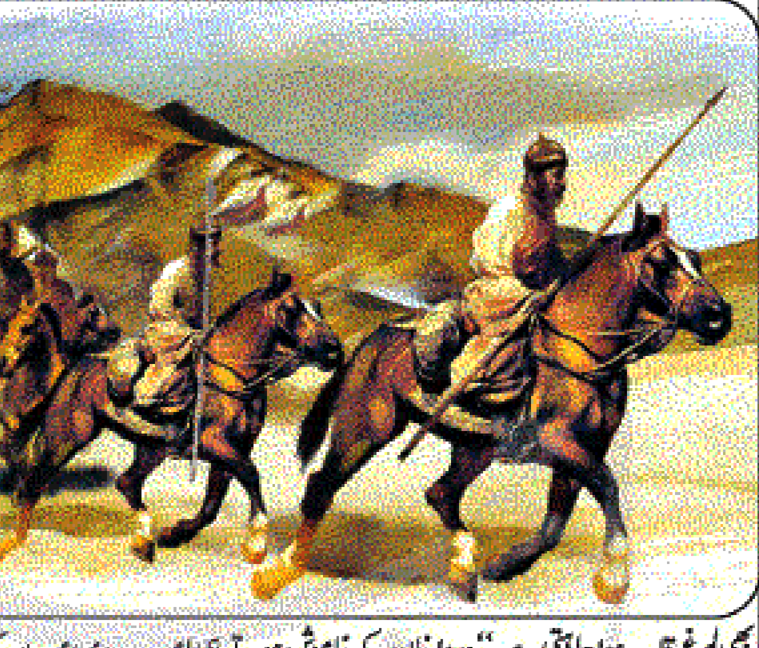
بیٹے کی صورت دیکھ کر مخدومہ جہاں نے صدقہ اُتارا اور بی بی کدبانو نے ننھے فیروز کو سینے سے لگا لیا۔ اس کی برباد محبت کی بس ایک یہی تو نشانی تھی۔ جواں سال بیٹے اور نوعمر بھتیجے کے خسرو خان کے نرغے سے بخیر و عافیت نکل آنے پر غیاث الدین تغلق غازی ملک بھی خدا کا شکر گزار تھا۔

خسرو خان کی بے تحاشا عنایات کو ٹھکرا کر اس کے عطا کردہ عہدے اور دولت کو لات مار کر جونا خان کا یوں چلے جانا، دیگر امراء کے لئے مثال بن گیا تھا...... انہیں اپنی خاموشی اور بے بسی پر اب افسوس ہونے لگا تھا۔ خسرو خان کی بداعمالیاں دن بدن بڑھتی جا رہی تھیں...... پانی سر سے اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ اب کچھ نہ کچھ کرنے کا وقت آ پہنچا تھا۔

چنانچہ چند عمر رسیدہ، زمانے کے سرد و گرم چشیدہ امراء و نوابین، بوڑھے امیر اسماعیل خان کی نشست گاہ میں جمع ہوئے۔ سب کے چہروں سے فکر ہویدا اور آنکھوں سے پریشانی مترشح تھی...... سب کے سر جھکے ہوئے تھے، بے بسی سے ہاتھ ملتے وہ ایک دوسرے کا چہرہ تک رہے تھے۔

"اگر اس وقت ہم نے کسی مردِ خدا کو آواز نہ دی تو...... اس سرزمین سے اسلام اور مسلمانوں کا نام و نشان مٹ جائے گا۔" کافی دیر بعد کرے کی خاموش فضا میں دردا خان کی آواز بلند ہوئی۔ "حضرت خواجہ کا بھی یہی مشورہ ہے کہ ہم سب کو کسی ایک جھنڈے تلے جمع ہو کر اس عذابِ الٰہی سے نجات کی راہ تلاش کرنی چاہئے۔"

"ان حالات میں جبکہ کشتی طوفانِ بلاخیز میں پھنسی ہوئی ہے اور کسی بھی لمحہ غرقاب ہوا چاہتی ہے۔" دردا خان کے خاموش ہوتے ہی امیر اسماعیل خان کی دھیمی مگر مضبوط آواز اُبھری۔ "ایسے میں بس ایک کھیون ہار ہے، جو اس کشتی کو صحیح و سالم نکال کر ساحل پر پہنچا سکتا ہے۔"



"وہ مردِ مومن کون ہے آخر؟" تمام لوگوں کی سوالیہ نگاہیں امیر اسماعیل کے چہرے پر آ ٹکی تھیں۔

"اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر...... ذرا اپنے ذہنوں کو ٹٹولو...... تمہارے دل و دماغ میں از خود وہ نام آ جائے گا۔" اسماعیل خان کی بات سن کر سب ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ چند لمحوں کی تطہیر اور تحلیل کے عمل کے بعد سب کے چہروں پر ایک تحریر ابھر آئی تھی۔ نوشتۂ دیوار کی مانند واضح اور جلی تحریر کہ جسے پڑھ کر ہر آنکھ امید کی روشنی سے جگمگا اٹھی تھی۔

"آپ بجا فرماتے ہیں ملک اسماعیل۔" دردا خان نے اپنی نشست سے اُٹھ کر مضبوط اور واضح آواز میں کہا۔ "ہم سب نے اس کھیون ہار کو پہچان لیا ہے اور وہ غیاث الدین تغلق ملک غازی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"اب خدا کے بعد وہی ہمارا ناخدا ہے۔" ملک اسماعیل خان نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور دردا خان سے مخاطب ہو کر بولا۔ "دردا خان، تم آج رات ہی دیپال پور کے لئے روانہ ہو جاؤ اور ہم سب کی وفاداری کا یقین دلا کر غازی ملک کو دلی پر حملہ کرنے کے لئے آمادہ کرو۔"

"ٹھیک ہے۔" دردا خان نے سرِ تسلیم کرتے ہوئے جواب دیا اور محفل برخاست ہو گئی۔

☆......☆......☆

خسرو خان کی بداعمالیوں اور بداعتدالیوں کی خبریں مسلسل غازی ملک تک پہنچ رہی تھیں۔ اس کی حرکتوں سے پہلے ہی اس کا دل کڑھ رہا تھا، تا آنکہ اہلِ دہلی کی گزارش بھی اس تک پہنچ گئی تھی۔

وہ سوچ میں ڈوب گیا۔

"آپ کو اس وقت اس دشمنِ دین، بدذات خسرو خان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لئے اقدام کرنا ہی چاہئے۔" جونا خان نے غصے سے کھولتے ہوئے باپ کو مشورہ دیا اور یقین دلایا۔ "آپ کا یہ بیٹا ہر ہر قدم پر آپ کے ساتھ ہے۔"

"تم میرا دایاں بازو اور میری طاقت ہو۔" غازی ملک نے آگے بڑھ کر بیٹے کے مضبوط شانے پر مضبوطی سے ہاتھ رکھتے ہوئے فخر میں ڈوبے لہجے میں کہا اور پھر لحظہ بھر سوچ کر اسی مضبوط لہجے میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "اگر امراء دہلی اور میرے لختِ جگر کی یہی خواہش ہے...... تو میں خاندانِ علائی کی ناموس کے دشمن نابکار خسرو خان کو نیست و نابود کرنے کے لئے ضرور اقدام کروں گا۔"

جونا خان کے وجیہہ چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔

"اب اگر ہم نے یہ فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ہمیں فوری طور پر قدم اٹھانا ہوگا، مزید تاخیر حالات کو مزید دگرگوں کر دے گی، اس لئے تم کل صبح ہی پنجاب کے لئے روانہ ہو جاؤ اور وہاں جا کر ایک لشکرِ جرار جمع کرو۔"

"جو آپ کا حکم بابا جان۔" جونا خان نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے جواب دیا۔

"جیتے رہو۔" باپ نے مسرت آمیز مسکراہٹ سے بیٹے کو دعا دی۔ "اب جلدی سے سو جاؤ تاکہ صبح دم تازہ دم اٹھ کر مہم پر روانہ ہو سکو۔"

"جی بہتر۔" جونا خان نے جواب دیا اور باپ کو شب بخیر کہتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

دروازے پر گیارہ سالہ فیروز خان کھڑا تھا۔

"ارے تم...... اب تک جاگ رہے ہو؟" جونا خان نے حیرانی سے سوال کیا۔

"آپ کے بغیر مجھے نیند کیونکر آ سکتی ہے۔" فیروز خان نے جواب دیا۔ "آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تاخیر کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔" جونا خان نے محبت بھرے لہجے میں بھائی سے کہا اور اس کا ہاتھ تھام کے خواب گاہ کی طرف چل دیا۔

خواب گاہ کے دروازے پر مخدومہ جہاں کو اپنا منتظر پا کر وہ حیران ہوا۔

"امی جان...... آپ...... اس وقت؟"

"جونا خان، مجھے تم سے ایک بے حد ضروری بات کرنی ہے۔" مخدومہ جہاں نے سنجیدگی سے اپنا عندیہ بیان کیا۔ "دن میں تو تم اپنے تعلیمی اور دیگر مشاغل میں گم رہتے ہو، اسی لئے میں نے سوچا رات کو جب تم سونے کے لئے خواب گاہ میں آؤ گے، بس اسی وقت تمہیں پکڑ لیا جائے۔"

"تشریف لایئے۔" جونا خان نے مؤدبانہ لہجے میں کہا اور ماں کو ساتھ لئے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

"تشریف رکھئے۔" سامنے رکھی کرسیوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کر کے اس نے ماں کو بیٹھنے کی پیشکش کی اور ماں کے بیٹھتے ہی خود مقابل کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس دوران فیروز خان کمرے کے انتہائی سرے پر بچھی مسہریوں میں سے ایک پر بیٹھ چکا تھا۔

"رات کافی بیت چکی ہے، اس لئے میں تمہید میں وقت ضائع کرنے کی بجائے اصل موضوع کی طرف آتی ہوں۔" مخدومہ جہاں نے بات کا آغاز کیا۔ "جونا خان، ماشاء اللہ تم شادی کی عمر کو پہنچ چکے ہو...... تمہارے بھائی بھی بڑے ہو رہے ہیں، تمہارا گھر آباد ہو تو پھر میں کچھ ان کے بارے میں بھی سوچوں...... مگر تم ہو کہ اس طرف توجہ ہی نہیں دیتے...... تمہارے اس گریز کو دیکھ کر مجھے تمہارے مرحوم چچا رجب کا خیال آتا ہے...... وہ بھی اسی طرح شادی سے گریزاں تھا مگر اس کی وجہ ایک خیالی تصویر تھی جو اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور وہ اپنے اسی خیالی پیکر جیسی لڑکی سے شادی کا آرزومند تھا۔" مخدومہ جہاں دم لینے کو دم بھر کو رُکی اور گہری نظر سے بیٹے کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں حیرت سے پلکیں جھپکاتا ماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہاں اس بات کا ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر تمہارے ذہن میں بھی ایسا کوئی نقش ہے یا تم کسی لڑکی کو پسند کرتے ہو تو بے جھجک اور بے خوف و خطر اپنی ماں سے کہہ سکتے ہو...... تم جس کی طرف بھی اشارہ کرو گے، میں اُس لڑکی کو اپنی بہو بنا کر اس گھر میں لے آؤں گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے امی جان۔" جونا خان نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "میں پہلے حصولِ تعلیم، پھر ملازمت کے مسائل میں اُلجھا رہا اور آج کل جو حالات ہیں، ان آلام و مصائب کے دور میں آپ بھلا میری شادی کے بارے میں سوچ بھی کس طرح سکتی ہیں...... بابا جان کا حکم ہے، کل صبح مجھے پنجاب کے لئے روانہ ہونا ہے۔"

"خدا تمہیں اور تمہارے بابا جان کو اس مہم میں کامیاب کرے۔" مخدومہ جہاں نے دامن پھیلا کر دعائیہ انداز میں کہا۔ "اس کامیابی کے بعد میں بالکل انتظار نہیں کروں گی اور فوری طور پر تمہارے سر پر سہرا سجا دوں گی۔"

"آپ کے کسی بھی حکم سے سرتابی کی مجھ میں جرأت نہیں ہے۔" جونا خان نے سعادت مند لہجے میں جواب دیا۔ "اب آپ اپنی خواب گاہ میں جا کر آرام کیجئے، آپ جیسا چاہیں گی، ویسا ہی ہوگا۔"

"جیتے رہو۔" مخدومہ جہاں مسرت بھرے انداز میں بولی اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

ماں کو رخصت کر کے جونا خان بستر کی طرف چلا آیا جہاں فیروز خان سوچوں میں ڈوبا بیٹھا تھا۔ اب وہ گیارہ برس کا ہو گیا تھا۔ وہ ایک ذہین اور باشعور لڑکا تھا...... اب وہ اس شام کو مرمر کے ستونوں سے گھرے دالان کی سنگی سیڑھیوں پر سماعت سے ٹکرانے والی باتوں کو بہتر طور پر سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

"ارے اب تک بیٹھے ہو، سوئے کیوں نہیں؟" جونا خان نے سوال کیا۔

"مجھے آپ سے ایک بات پوچھنی ہے...... اگر آپ اجازت دیں تو میں وہ سوال کروں، جو بڑی امی جان کی باتیں سن کر میرے ذہن میں پیدا ہوا ہے؟"

فیروز خان کے سنجیدہ اور مدبرانہ لہجے پر جونا خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا اور اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"آپ شادی کے لئے بڑی امی جان کو آخر اس لڑکی کا نام کیوں نہیں بتا دیتے؟"

فیروز خان کی بات پر جونا خان اچھل پڑا۔

"کون سی لڑکی؟" اس نے تحیر بھرے لہجے میں سوال کیا۔

"وہی لڑکی...... اُس شام جس نے آپ سے بہت سی باتیں کی تھیں۔"

"کیا تم نے وہ باتیں سنی تھیں؟" جونا خان نے خائف نظروں سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"جی۔" فیروز خان نے سر جھکا کر اقرارِ جرم کیا۔ "میں آپ سے چند قدموں کے فاصلے پر انہی سنگی سیڑھیوں پر موجود تھا۔"

"ایک بات یاد رکھو فیروز۔" جونا خان نے اس کے شانے کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "ان باتوں کو کبھی زبان پر مت لانا...... اس طرح ایک اچھی لڑکی کے بدنام ہونے کا خدشہ ہے...... تم بالکل بھول جاؤ کہ اس شام تم نے کیا سنا تھا...... اگر تم اپنے بھائی سے ذرہ بھر بھی محبت کرتے ہو، تو اس شام کی کسی بھی بات کو تاحیات کبھی زبان پر مت لانا۔"

"زبان پر لانا تو دور، میں اب کبھی ذہن میں بھی وہ باتیں نہیں لاؤں گا۔" فیروز خان نے اقراریہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر پہلے آپ کو میری ایک بات کا جواب دینا ہوگا۔"

جونا خان نے فیروز کے سنجیدہ چہرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"اس شام میں نے جو باتیں سنی، اُن باتوں سے میں جو سمجھ سکا، وہ یہی بات ہے کہ وہ لڑکی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے...... تو پھر آپ اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"شادی...... بچے، گھر گرہستی...... یہ سب ایک عام آدمی کی سوچ کی حدیں ہیں۔" جونا خان نے پُرسوچ نظروں سے فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ان حدوں سے آگے نکل کر سوچنا چاہتا ہوں...... میں اپنی ذات کے مفاد سے بالاتر ہو کر انسانیت کے لئے، معاشرے کے لئے، اپنے لوگوں کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں...... میں آنے والے زمانوں میں اور تاریخ کے صفحات میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

"مگر بڑی امی جان تو کہتی ہیں کہ انسان کا نام اس کی اولاد زندہ رکھتی ہے۔" فیروز نے مدبرانہ انداز میں بات آگے بڑھائی۔

"ہاں، نام چلانے کے لئے کوئی تو ہونا چاہئے۔" جونا خان نے مسکرا کر فیروز کی طرف دیکھا۔ "ضروری تو نہیں کہ وہ اولاد ہی ہو...... تم بھی تو میرا نام چلا سکتے ہو...... میرے بعد میرے لئے مغفرت کی دعا کر سکتے ہو...... والی اور وارث بیٹے ہی کیوں، بھائی بھی تو ہو سکتے ہیں۔" جونا خان نے پیار سے اُسے شانوں سے تھام کر اپنی آنکھوں کے سامنے کرتے ہوئے پوچھا۔ "فیروز خان، کیا میں امید رکھوں کہ میرے بعد میرے لئے دعائے خیر کرنے والے تم...... ہو گے...... تم میرے بھائی...... میرے وارث......"

"بھائی جان۔" فیروز نے اپنے شانے پر رکھا جونا خان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ "آپ امید نہیں، یقین رکھئے...... میں آپ کا نام زندہ رکھوں گا...... آپ کی خوشی، آپ کی راحت کے لئے کچھ بھی کر گزروں گا...... آپ کو مجھ سے کبھی مایوسی نہیں ہوگی۔"

"جیتے رہو میرے لاڈلے۔" جونا خان نے اسے کھینچ کر اپنے سینے میں چھپا لیا اور بولا۔ "اب جلدی سے سو جاؤ...... مجھے کل صبح ایک بڑے کام کے لئے روانہ ہونا ہے۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" فیروز خان نے جواب دیا۔

"مگر فیروز......" جونا خان نے ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں کچھ کہنا چاہا۔

"بڑا کام کرنا چاہتے ہیں تو مجھے چھوٹا مت سمجھئے۔" فیروز اس کی بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں ہر حال میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔"

"اگر ہمارے بڑوں نے اجازت دی تو مجھے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔" جونا خان نے ہتھیار ڈالتے ہوئے مسکرا کر کہا اور سونے کے لئے بستر پر دراز ہو گیا۔

☆......☆......☆

دربار میں موت کا سا سکوت طاری تھا۔ درباریوں کے چہرے اُترے ہوئے اور متفکر تھے۔

زیادہ تر درباری خسرو خان کے قبیلے کے ہندو گجراتی تھے، جنہیں اس نے قدیمی امراء کو معزول یا قتل کروا کر دربار میں جگہ دی تھی۔ سامنے تختِ شاہی پر خسرو خان جلوہ افروز تھا...... اس کے چہرے سے فکر و تردد کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کے دائیں جانب قریب ترین جگہ پر عین الملک ملتانی سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ عین الملک ملتانی اور جونا خان کا ان چند امراء میں شمار تھا جنہیں خسرو خان نے خاص اہمیت اور عزت دی تھی۔ وہ دونوں شجاع اور قابل باپ کے بیٹے تھے اور خود بھی صاحبِ علم انسان تھے، اس لئے انہیں اور ان کے باپوں کو اپنے ساتھ ملائے رکھنے کی امید پر اس نے ان دونوں پر نوازشوں کی بارش کر دی تھی، اس کے باوجود جونا خان اس کی نوازشوں اور عنایتوں کو ٹھوکر مار کر چلا گیا تھا اور اب خبر آئی تھی کہ غازی ملک اور جونا خان پنجاب میں ایک بڑا لشکر تشکیل دے رہے تھے۔

"مجھے اس بات کا خدشہ تھا۔" کافی دیر کی خاموشی کے بعد خسرو خان نے فکرمند لہجے میں بات کا آغاز کیا اور گہری نظروں سے درباریوں کے پریشان چہروں اور جھکے سروں کی طرف دیکھا۔

"اس سے قبل کہ وہ لشکر لے کر دہلی پر چڑھائی کرے۔" اس نے اپنے بھائی حسام الدین کی طرف دیکھا۔ "میں چاہتا ہوں حسام الدین تم اور ملک شائستہ خان فوج لے کر جاؤ اور راستے میں روک کر اس کا کام تمام کر دو۔"

☆......☆......☆

حسام الدین اور شائستہ خان لشکر لے کر روانہ ہوئے۔ سرستی کے مقام پر غازی ملک اور جونا خان کے لشکر سے سامنا ہوا۔

67 سالہ غیاث الدین تغلق غازی ملک نے 19 سال کی عمر میں علاء الدین کے بھائی الغ خان کے لشکر میں ایک سپاہی کی حیثیت سے سپہ گری کے پیشے کو اختیار کیا تھا۔ اپنی لیاقت اور اہلیت کی بنا پر وہ جرنیل کے عہدے پر پہنچا تھا، اس نے دیپال پور اور سمانہ کے کماندار کی حیثیت سے 29 جنگیں منگولوں سے لڑی تھیں اور ہر بار فتح یاب ہو کر "غازی ملک" کا خطاب پایا تھا۔ وہ ایک قابل، دانا اور میدانِ جنگ کا آزمودہ جرنیل تھا جبکہ مخالف حسام الدین اور شائستہ خان رسومِ جنگ اور معرکۂ جنگ و جدل سے ہرگز واقف نہ تھے۔ غازی ملک کے پہلے حملے کی تاب نہ لا کر شکست فاش پائی۔ گھوڑے، ہاتھی اور دیگر اسبابِ غنیم چھوڑ بھاگے اور جا کر خسرو خان کے قدموں میں پناہ لی۔

اس پہلی شاندار فتح پر غازی ملک اور جونا خان بارگاہِ رب العزت میں سجدہ ریز ہوئے اور جو کچھ مالِ غنیمت ہاتھ آیا تھا، سپاہ میں تقسیم کیا اور ایک نئے جذبے اور ولولے سے دہلی کی طرف کوچ کیا۔

خسرو خان کو لمحہ لمحہ کی خبر پہنچ رہی تھی۔ پل پل اس کے اضطراب میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس نے بچا کھچا خزانہ سپاہیوں کو پیشگی تنخواہ دے کر ایک حبہ بھی خزانے میں نہ چھوڑا، لعل و گوہر و جواہرات بھی اپنے رفیقوں میں بانٹ دیئے اور لشکر لے کر دہلی سے نکلا اور بہروت کے مقام پر حوضِ علائی کے قریب صف آراء ہوا۔

اس رات کو جنگ شروع ہونے سے پہلے عین الملک ملتانی، خسرو خان سے کنارہ کش ہو کر اپنا دستہ لے کر مندو کے لئے روانہ ہو گیا۔ ملتانی سے خسرو خان کو بڑی اُمیدیں وابستہ تھیں، اس کا یوں چھوڑ جانا اس کے لئے دل شکستگی اور سراسیمگی کا باعث تھا۔ گزرتے وقت کا ہر لمحہ اُسے خائف اور مضطرب کر رہا تھا۔

غازی ملک لشکرِ جرار لے کر سر پر آ موجود ہوا۔ جنگ کا آغاز ہوا۔ پہلے ہی حملے میں خسرو خان کے دونوں جرنیل تلیغہ ناگوری اور شائستہ خان مارے گئے۔ خسرو خان نے خود سپہ سالاری سنبھالی اور عصر کے وقت تک غازی ملک کا مقابلہ کرتا رہا اور آخر کو میدانِ جنگ سے فرار ہو کر اپنے ایک رشتے دار ملک شادی کے گھر میں جا کر روپوش ہو گیا۔

اور غیاث الدین تغلق غازی ملک اپنے لائق بیٹے جونا خان کے ساتھ فاتحانہ انداز میں دہلی میں داخل ہوا۔ خسرو خان کا بھائی حسام الدین جو آم کے ایک باغ میں جا چھپا تھا، غازی ملک کے سپاہیوں نے اسے پکڑ کر وہیں اس کا کام تمام کر دیا۔ اگلی صبح خسرو خان کو گرفتار کر کے غازی ملک کے حضور پیش کیا گیا۔

"تجھ جیسے بدبخت ظلم کرتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ سب سے بڑی اور قائم رہنے والی ذات صرف خدا کی ہے۔" غازی ملک نے کرب بھرے لہجے میں کہا اور خنجر نکال کر اسی وقت اس نابکار کا سرتن سے جدا کر کے اُسے واصلِ جہنم کیا۔

خلجی حکمرانوں کے تمام امراء غازی ملک کے اطراف جمع ہو گئے تھے۔ ان سب کے ہمراہ غیاث الدین غازی ملک قصرِ ہزار ستون میں داخل ہوا۔ محل میں ویرانی چھائی ہوئی تھی، تمام شاہزادے مارے جا چکے تھے اور حرم اُجڑ چکا تھا۔

محل کی ویرانی اور وحشت دیکھ کر غازی ملک کی آنکھوں سے اشک جاری ہو گئے۔ وہ سلطان علاء الدین خلجی کو یاد کرتا دربار میں داخل ہوا اور تختِ علائی سے لپٹ کر فریادی انداز میں بولا۔

"میرے آقا...... میرے سلطان...... میں آپ سے سخت شرمندہ ہوں...... کاش ایسا اقدام میں نے آپ کی زندگی میں...... آپ کی خاطر اٹھایا ہوتا اور آپ کے گرد جمع نمک حراموں کو تہ تیغ کر دیا ہوتا۔"

دیگر لوگوں کی آنکھیں بھی اشکبار تھیں۔ ہر سمت ایک رقت آمیز کیفیت طاری تھی، فضا میں سوگواری اور پژمردگی رچی ہوئی تھی۔ ہر دل افسردہ اور ہر چہرہ ملول تھا۔

کئی لمحے اسی کیفیت میں گزر گئے، پھر غازی ملک نے ہاتھ اٹھا کر مرحوم سلطان اور اس کے اہلِ خاندان کی مغفرت کی دعا کی...... دربار میں ایک بار پھر کرب آمیز خاموشی چھا گئی تھی۔ سب سر جھکائے افسردہ و خاموش کھڑے تھے۔ آخر غازی ملک نے بھیگی پلکیں اٹھائیں اور نم لہجے میں گویا ہوا۔

"خداوند تعالیٰ کی کرم نوازی اور آپ سب کی معاونت سے میں یہ معرکہ سر کرنے میں کامیاب ہوا...... نابکار اور غاصب خسرو واصلِ جہنم ہوا...... میں نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، وہ پایۂ تکمیل کو پہنچا...... اب آگے آپ لوگوں کا کام شروع ہوتا ہے...... میری آپ سب سے گزارش ہے کہ باہمی صلاح مشورے سے خاندانِ خلجی کے کسی فرد کو حکمران چن لیجئے اور مجھے اجازت دیجئے...... میں آج شام کو ہی دیپال پور کے لئے روانہ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

دربار میں ایک دم سے بھنبھناہٹ جاگ اٹھی تھی۔ سپاہی حیران و پریشان ہو کر ایک دوسرے کا چہرہ تکنے لگے، باہمی گفت و شنید اور صلاح و مشورے میں مصروف ہو گئے۔

ملک کافور، قطب الدین مبارک اور خسرو نے سلطنتِ خلجی پر قبضہ جمانے کے لئے خاندانِ علائی کے افراد کو یکسر ختم کر دیا تھا، چن چن کے ایک ایک شاہزادے کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس وقت خاندانِ خلجی کا ایک بھی ایسا فرد موجود نہ تھا تختِ دہلی جس کے سپرد کیا جا سکتا۔

کافی دیر کے صلاح مشورے اور سوچ بچار کے بعد بوڑھا امیر، ملک اسماعیل خان آگے بڑھا اور دست بستہ عرض کیا۔

"غازی ملک، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ ملک کافور اور خسرو خان نے خاندانِ خلجی کے تمام شاہزادوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ اب ایک فرد بھی ایسا موجود نہیں، جو یہ ذمے داری احسن طریقے سے اٹھا سکے۔" وہ لحظہ بھر کو تھما، پھر اسی مؤدبانہ انداز میں گویا ہوا۔ "اس لئے ہم سب نے نہایت غور و خوض کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ظالم خسرو خان سے آپ نے ہی ہمیں نجات دلائی ہے...... تو اس کرب و ابتلا کے دور میں آپ ہی قوم کے نجات دہندہ ثابت ہو سکتے ہیں...... اس لئے ہم سب کی گزارش ہے کہ آپ یہ بھاری ذمے داری قبول فرما لیجئے۔"

"کیا مطلب؟" غازی ملک نے حیران نظروں سے درباریوں کی طرف دیکھا۔ "کیا میری سماعت مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی...... میں وہی سن رہا ہوں جو سمجھ رہا ہوں...... آپ لوگوں کا مطلب ہے کہ......"

"جی غازی ملک۔" دردا خان آگے بڑھا۔ "ہم سب کی گزارش ہے کہ حکومت کی ذمہ داری آپ قبول فرما لیں، ہم سب آپ کو اپنا اور دہلی کا سلطان چننا چاہتے ہیں۔"

"نہیں دردا خان...... یہ ناممکن ہے۔" غازی ملک نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "میں 67 سال کا ایک بوڑھا انسان ہوں، میرے ناتواں کاندھے سلطنت کا یہ بھاری بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہیں...... اس لئے میری طرف سے معذرت قبول کرو اور تم لوگ اپنے لئے کوئی اور سلطان منتخب کر لو۔"

"ہمارا اول و آخر انتخاب صرف اور صرف آپ ہیں۔" تمام امراء نے یک زبان ہو کر کہا۔ "آپ کو یہ ذمے داری قبول کرنا ہی ہوگی۔"

غازی ملک نے مشورہ طلب نگاہوں سے اپنے پہلو میں کھڑے جونا خان کی طرف دیکھا۔ "تم کیا کہتے ہو جونا خان؟"

"حتمی فیصلہ تو آپ کا اپنا ہوگا۔" جونا خان نے دھیمی اور مؤدبانہ آواز میں جواب دیا۔ "مگر حالات کے پیشِ نظر اگر آپ مجھ سے مشورہ طلب کرتے ہیں تو میرا مشورہ یہی ہوگا کہ ان حالات میں ملک و قوم کو آپ جیسے سلطان کی ضرورت ہے، مانا کہ کبرسنی کے باعث آپ یہ ذمہ داری اٹھانے سے گریزاں ہیں مگر یقین رکھئے آپ اکیلے نہیں ہیں، یہ تمام امراء اور آپ کے بیٹے آپ کے کاندھے سے کاندھا ملا کے چلنے کا حوصلہ اور ارادہ رکھتے ہیں۔"

بیٹے کی باتیں سن کر غازی ملک کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی۔ اس نے سامنے کھڑے درباریوں پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہنا شروع کیا۔

(جاری ہے)

سلطان محمد تغلق

اشتیاق عامر علی

قسط : 7

"اگر آپ سب کی یہی خواہش ہے تو میں خود کو اس آزمائش میں ڈالنے کے لئے مجبور پاتا ہوں...... میں آپ کے تعاون اور رب کریم کی مدد کا خواستگار ہوں تاکہ اس بھاری ذمے داری سے عہدہ برآ ہوکر سرخرو ہوسکوں۔"

درباریوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مرجھائے اور اُترے ہوئے چہروں پر رونق جاگ اٹھی تھی اور مایوس آنکھیں امید کی روشنی سے جگمگانے لگی تھیں اور لوگ خوشی سے لبریز لہجے میں "سلطانِ ہند زندہ باد...... سلطانِ معظم زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے تھے۔

8 ستمبر 1320ء کو قصر ہزار ستون میں تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی اور غازی ملک "غیاث الدین تغلق" کے لقب سے تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔

علاء الدین خلجی کے انتقال کے تقریباً چار سال بعد خلجی خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور غیاث الدین تغلق نے خاندان تغلق کی بنیاد ڈالی۔

غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی کے وقت ملک میں سخت بدامنی اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ قطب الدین مبارک شاہ نے عیش و نشاط میں غرق ہونے کے سبب علاء الدین خلجی کی تمام اصلاحات پر پانی پھیر دیا تھا اور ہر قسم کی بے راہ روی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ عوام کے دل سے بادشاہ اور حکومت کا رعب و دبدبہ ختم ہوچکا تھا، معاشرتی نظام کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ ملک کافور اور خسرو خان کی پالیسیوں کی وجہ سے خزانہ شاہی خالی ہوچکا تھا۔

ان حالات میں غیاث الدین تغلق نے انتہائی تدبر اور دور اندیشی سے کام لیا اور ہر معاملے میں اعتدال اور میانہ روی کو اختیار کیا۔

خلجی دور کے امراء اور خصوصاً ان لوگوں سے جنہیں خاندان علائی سے ذرا بھی نسبت تھی، بے حد عزت و احترام سے پیش آتا تھا اور تمام اقدامات میں ان کے مشوروں کو فائق رکھتا تھا۔ انہی کے مشورے کی روشنی میں اس نے جونا خان کو ولی عہد نامزد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ملک جونا خان، غیاث الدین تغلق کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور دیگر تمام بیٹوں میں سب سے لائق اور قابل تھا۔ وہ ہر مشکل اور آزمائش میں ہمیشہ ہی اس کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوا تھا اور ہمیشہ ہی اس کی طاقت اور بازو بنا تھا۔ غیاث الدین کو وہ بے حد عزیز تھا۔ اسی لئے اس نے جونا خان کو ولی عہد نامزد کرکے اسے الغ خان کا خطاب عطا کیا تھا۔

جونا خان بڑا ہونے کے علاوہ اپنی لیاقت، صلاحیت اور اہلیت کی بناء پر اس عزت کا حق دار تھا۔ اسی لئے کسی کو بھی اعتراض نہ ہوا بلکہ سب ہی نے مسرت کا اظہار کیا۔

جونا خان کی ماں مخدومہ جہاں، شوہر اور بیٹے کی اس کامیابی پر ازحد مسرور تھی۔ وہ اپنے کنبے کے ساتھ دہلی آئی تو اس نے سب سے پہلے نظام الدین اولیاءؒ سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی خواہش تھی کہ اس بار جب وہ خواجہ صاحبؒ کے آستانے پر حاضر ہو تو اس کے ساتھ اس کا شوہر تاجدار ہند اور اس کا لختِ جگر ولی عہد سلطنت بھی ساتھ ہوں۔

چنانچہ اس نے غیاث الدین تغلق کے سامنے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا۔

"اگر آپ کو ناگوار خاطر نہ ہو تو میں ایک گزارش کرنا چاہتی ہوں۔" اس شام اس نے موقع پاکر غیاث الدین سے قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ آج کل وہ بے حد مصروف رہتا تھا۔ صبح سے شام تک دربار لگاتا اور ملک و قوم کی شکستہ و خستہ حال کشتی کو پار لگانے کی تدابیر میں لگا رہتا تھا۔

"ہاں بولو...... آخر ایسی کیا بات ہے؟" اس نے چونک کر بیوی کی طرف دیکھا۔

"پہلے آپ وعدہ کریں کہ میری بات مان لیں گے۔" مخدومہ جہاں نے یقین دہانی چاہی۔

"مخدومہ، ہم نے باہمی رفاقت میں ایک عمر گزاری ہے۔ تم جانتی ہو تم مجھے بے حد عزیز ہو مگر تم یہ بھی جانتی ہو کہ میں بات سنے بغیر پورا کرنے کا وعدہ نہیں کرسکتا۔"

"جی۔" مخدومہ جہاں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "میری آرزو ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانے پر حاضری کے لئے جاتے وقت آپ اور جونا خان بھی میرے ساتھ ہوتے۔"

"تم جانتی ہو مخدومہ...... میں اس قسم کے پیروں، فقیروں اور بزرگوں پر اعتقاد نہیں رکھتا۔"

"مگر آپ یہ مانتے ہیں کہ ہمیں جونا خان انہی کی بدولت ملا ہے۔"

مخدومہ کی یاددہانی پر غیاث الدین چیخ کر بولا۔ "لاحول ولا قوۃ...... بزرگ دعا تو کرسکتے ہیں، عطا نہیں کرسکتے...... عطا کرنے والی صرف خدائے بزرگ و برتر کی ذات ہے۔"

"دیکھئے......" مخدومہ نے کچھ کہنا چاہا۔

"دیکھو مخدومہ، تم جانتی ہو، میں کبھی اس بات کا قائل نہیں ہوسکا کہ کوئی انسان اتنا صاحبِ اختیار ہوسکتا ہے کہ وہ عطا کے منصب پر فائز ہوجائے۔ یہ طاقت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ انسان کیا، کائنات کی ہر مخلوق اللہ کی محتاج ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا نہیں دیتا...... خیر اس بحث کو چھوڑو...... تم اگر خواجہ صاحبؒ کے آستانے پر جانا چاہتی ہو تو ضرور جاؤ...... جونا خان بھی جانا چاہے تو اُسے بھی ساتھ لے جاؤ مگر مجھ سے کبھی توقع نہ رکھنا کہ میں اللہ کے سوا کسی اور کی عظمت کو تسلیم کروں یا اس کے سامنے سر جھکاؤں گا۔"

غیاث الدین تغلق اپنی بات مکمل کرکے کمرے سے جاچکا تھا۔ مخدومہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔ تب ہی جونا خان کمرے میں داخل ہوا۔ ماں کا اُداس چہرہ دیکھ کر وہ اس کے قریب چلا آیا۔

"امی جان، آپ اس قدر افسردہ کیوں دکھائی دے رہی ہیں۔ کیا بابا جان سے کوئی بات ہوئی ہے؟"

"جونا خان" مخدومہ جہاں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر قریب بٹھاتے ہوئے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ "میں اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ شکرگزار رہی ہوں کہ اس نے تمہارے بابا جان جیسا اچھا خاوند مجھے عطا کیا...... یہ بات تو تم جانتے ہی ہو کہ تمہاری ولادت شادی کے کتنے سالوں بعد ہوئی...... حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ تمہاری دادی جان بھی بیٹے کی دوسری شادی پر آمادہ ہوگئی تھیں مگر تمہارے بابا جان کا کہنا تھا کہ اگر اللہ کو مجھے اولاد دینی ہے تو مخدومہ سے ہی ہوگی...... پھر میں نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر دعا کی درخواست کی تھی۔ ان کی دعا کے طفیل اللہ نے مجھے تمہیں عطا کیا...... اسی لئے میری خواہش تھی کہ آج میرے ساتھ تمہارے علاوہ تمہارے بابا جان بھی حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکریہ ادا کرتے مگر ان کا کہنا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی برگزیدہ اور پسندیدہ کیوں نہ ہو، وہ بندہ ہی رہتا ہے، کچھ اور نہیں بن جاتا...... اور کوئی بھی شخص خواہ وہ کسی مقام پر بھی فائز ہو، دعا تو کرسکتا ہے، پر عطا نہیں کرسکتا۔"

"اس سلسلے میں، میں بھی بابا جان کا ہم خیال ہوں۔" جونا خان نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "دینے والی صرف اللہ کی ذات ہے مگر جہاں تک نظام الدین اولیاءؒ کا تعلق ہے، میں انہیں اوروں سے مختلف پاتا ہوں اور دل میں ان کے لئے ایک خاص عقیدت رکھتا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔" مخدومہ جہاں نے بیٹے کے چہرے کی طرف دیکھ کر پیار بھرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر سب باتیں چھوڑیے...... چلئے میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" جونا خان یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

جب وہ دونوں ماں بیٹے حضرت خواجہؒ کے آستانے پر پہنچے تو بیرونی دالان میں محفل سماع جاری تھی۔ امیر خسرو کا صوفیانہ کلام قوال لہک لہک کر گارہے تھے۔ خود خواجہ صاحبؒ پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔

خدام، مخدومہ جہاں کو خواتین کے لئے مخصوص اندرونی حجرے میں لے گئے جبکہ جونا خان خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سامنے دوزانو ہوکر بیٹھ گیا۔ جونا خان پر نگاہ پڑتے ہی انہوں نے جذب کی سی کیفیت میں نعرہ بلند کیا۔ "لو...... سلطان آگیا...... میری دلی کا تاجدار آگیا۔"

کئی لوگ چونک کر سیدھے ہوئے۔ انہیں گمان ہوا کہ شاید غیاث الدین تغلق آیا ہے مگر جونا خان کو دیکھ کر وہ چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔

"اللہ نے تجھے سلطان چنا ہے۔" نظام الدین اولیاءؒ نے کہا۔ "یہ تختِ دلی تیرے لئے ہے...... جلد یا بدیر تجھے ہی اس تخت پر متمکن ہونا ہے۔" جونا خان سر جھکائے خاموشی اور سعادت مندی سے خواجہ صاحبؒ کی بات سن رہا تھا۔

☆......☆......☆

مخدومہ جہاں جوں ہی حجرے میں داخل ہوئی، حجرے میں پہلے سے موجود دونوں خواتین اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک عمر رسیدہ خادمہ تھی جبکہ دوسری ایک خوش جمال دوشیزہ تھی۔

"آداب ملکۂ عالیہ" دونوں خواتین جھک کر کورنش بجالائیں۔

"آپ دونوں مجھے کیسے پہچانتی ہیں؟" مخدومہ جہاں حیران ہوئی۔

"ایک آدھ بار شاہی تقریب میں آپ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔" لڑکی نے شائستہ لہجے میں بتایا۔

"آپ کون ہیں؟" مخدومہ جہاں نے اس کے دلکش چہرے اور اُداس آنکھوں کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"میں مرحوم نصرت خان کی بیٹی زرنگار بانو ہوں اور یہ میری اتا بجستہ بی بی ہیں...... سکونِ قلب کی جستجو میں ہم اکثر یہاں چلی آتی ہیں۔"

"اوہ......" مخدومہ جہاں کی آنکھوں میں شناسائی جاگی۔ "تمہارے والد کے انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا تھا...... اب کس کے ساتھ ہو...... شادی تو غالباً اب تک نہیں ہوئی؟" مخدومہ نے زرنگار کے مہندی، چوڑی اور زیور سے محروم ہاتھ اور چہرے کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی۔" زرنگار نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "اب تو بس اللہ کا ہی سہارا ہے۔"

تب ہی بجھڑے ہوئے کواڑوں کی جھری سے بالکل اچانک ہی اس کی نگاہ حضرت خواجہؒ کے روبرو بیٹھے جونا خان پر پڑی۔ وہ پہلے سے زیادہ باوقار، شاندار اور وجیہہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یک ٹک اُسے دیکھا کی۔

"تم جیسی اچھی، خوبصورت اور نیک سیرت لڑکی کے لئے یقیناً رشتوں کی کمی نہ ہوگی مگر چونکہ تمہارے والدین حیات نہیں ہیں، اس لئے ممکن ہے کچھ مشکلات درپیش ہوں لیکن کسی بھی لڑکی کے لئے شادی بے حد ضروری ہے...... تمہیں خواجہ حضرتؒ سے اس سلسلے میں دعا کی درخواست کرنی چاہئے۔"

مخدومہ جہاں کے ہمدردانہ مشورے پر زرنگار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

"دعا؟"

"ہاں، مجھے حضرت خواجہؒ کی دعا پر بے حد یقین ہے...... مجھے انہی کی دعا سے اولاد کی دولت حاصل ہوئی۔" مخدومہ جہاں نے کواڑ کی جھری سے اُس پار دالان میں بیٹھے جونا خان کو محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے پُرعقیدت لہجے میں بتایا۔

"آپ کا مطلب ہے، میں بھی حضرت سے...... شادی کی دعا...... کی درخواست کروں؟" زرنگار کے سپید رخساروں پر حیا کی سرخی بکھر گئی تھی۔

"ہاں، اس میں شرم کیسی؟" اُسے فرطِ حیا سے سمٹتے دیکھ کر مخدومہ نے بااعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "شادی ہر لڑکی کا مذہبی حق ہے...... اور اسلام نے تو لڑکی کو یہ حق بھی دیا ہے کہ وہ اگر کسی کو پسند کرے تو خود بھی شادی کا پیام دے سکتی ہے۔"

زرنگار چند لمحوں تک مخدومہ جہاں کو حیرت سے تکتی رہی۔ پھر اس نے نگاہ جھکا کر سادگی سے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایسا تو کرچکی ہوں خاتونِ محترم۔" زرنگار کے دھیمے لہجے میں ناکامی اور اذیت کا احساس ہلکورے لے رہا تھا۔ "مگر اسے کیا کیجئے...... کہ حرماں نصیبی سے میرا پیام...... رد کردیا گیا......"

"اوہ!" مخدومہ نے حیرت اور بے یقینی سے اُس حسین اور باحیا دوشیزہ کی طرف دیکھا جو ایک باوقار و باعزت خاندانی پس منظر بھی رکھتی تھی۔ صورت ہی نہیں، سیرت میں بھی یکتا تھی۔ بھلا ایسی دلکش و رعنا لڑکی کا پیام کون رد کرسکتا تھا؟

"اگر کوئی اس حماقت کا مرتکب ہوا ہے تو...... جانو وہ بدنصیب ہے۔"

"نہیں، وہ تو طالع نصیب ہیں...... بدنصیب تو میں ہوں، جو ان کی نگاہ کا انتخاب نہ بن سکی۔"

"کانٹوں بھری زندگی کا سفر تنہا طے کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔" مخدومہ جہاں نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔ "تمہیں اس نادان کو بھلا کر اپنے لئے کسی اور ہم سفر کو چن لینا چاہئے۔"

"میرے لئے ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔" زرنگار نے تڑپ کر جواب دیا۔ "میں نے سوچا ہے کہ مرتے دم تک انہی کے نام پہ بیٹھی رہوں گی۔"

چھاپ تلک سب چھین لی رے موسے نیناں ملائی کے
نیناں ملائی کے نینوں میں آئی کے
موہے سہاگن کی رے موسے نیناں ملائی کے

امیر خسرو کی سچے جذبوں سے گندھی شاعری، قوال کی لہکتی آواز کے ساتھ بیک وقت مخدومہ اور زرنگار کی سماعت سے ٹکرائی تھی اور زرنگار کی کرب بھری نگاہیں ایک بار پھر کواڑ کی جھری سے گزر کر اپنے مطلوب کے چہرے پہ جا ٹکی تھیں۔

اور مخدومہ جہاں بے ساختہ اپنے ماضی کے کھنڈرات میں کھوگئی تھی۔ جب اس کے باپ نے اس کے لئے کسی اور کا پیام قبول کرنے کا فیصلہ کیا تھا جبکہ وہ ہوش سنبھالتے ہی غیاث الدین کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی اور اس کے سوا کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر اسے غیاث الدین نہ ملتا تو کیا وہ کسی اور سے ناتا جوڑ سکتی تھی؟

"ہرگز نہیں۔" خود سے کئے گئے سوال پر اس کے دل نے پورے یقین سے جواب دیا تھا۔ بالکل وہی صورت حال اس وقت اس کے سامنے بیٹھی اس دل گرفتہ لڑکی کے ساتھ بھی درپیش تھی۔

گھر آنے کے بعد بھی وہ کافی دیر تک زرنگار اور اس کی ناکام محبت کے بارے میں سوچتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

غیاث الدین تغلق شب و روز نظام حکومت میں موجود برائیوں اور خرابیوں کو دور کرکے ملکی نظم و نسق کو ازسرِنو درست کرنے کی تگ و دو میں مصروف تھا۔

اس نے ان تمام افراد سے جنہیں خسرو شاہ نے بڑی بڑی رقمیں انعام میں دی تھیں، دباؤ ڈال کر تمام کی تمام واپس لے لیں اور ان کا اکثر حصہ علاء الدین خلجی کے پسماندگان کو وظائف کی صورت میں عطا کیا۔ امور سلطنت میں بھی وہ خلجی کے امراء سے مشورہ لینا ضروری سمجھتا تھا۔ اس نے کوشش کی کہ ساری رعایا برسرِ روزگار رہے تاکہ چوری اور ڈاکے کی وارداتیں نہ ہوں۔ اس نے محتاجوں کی مدد کے لئے ایک علیحدہ محکمہ کھولا۔ اس کے جذبۂ خلوص نے یہاں تک اثر کیا کہ اس کے عہد میں چوروں اور ڈاکوؤں نے اپنے ہتھیار فروخت کرکے کاشتکاری کا پیشہ اختیار کرلیا تھا چنانچہ راستے اور شاہراہیں بالکل محفوظ ہوگئی تھیں اور تاجر ملک کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک بلاخوف و خطر سفر کرتے تھے۔

سلطان خود چونکہ ایک آزمودہ کار جرنیل تھا۔ اس لئے وہ فوج کی اہمیت اور ضرورت سے خوب واقف تھا۔ اس نے فوج کی حالت درست رکھنے کے لئے گھوڑوں کو داغنے، سواروں کے حلیے کے اندراج اور اسلحہ کی جانچ پڑتال کے قاعدے کا سختی سے نفاذ کیا۔

رشوت کو کم کرنے کے لئے اس نے ملازمین کی تنخواہیں بڑھادیں اور شرح مالگزاری میں بھی تخفیف کردی اور آدھے حصے کی بجائے چوتھائی شرح مقرر کردی۔

غیاث الدین تغلق ایک رحم دل، اعتدال پسند اور خداترس مسلمان تھا۔ اس کی عقل و فراست کی تعریف امیر خسروؒ نے یوں کی ہے۔

"وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرتا تھا جو عقل و فراست سے خالی ہو، وہ تاج کے نیچے سیکڑوں علماء کا دماغ رکھتا تھا۔"

غیاث الدین تغلق علم و ہنر کا بھی قدردان اور سرپرست تھا۔ بہت سے علماء و شعراء اس کے دربار کی زینت تھے۔ حضرت امیر خسروؒ بھی درباری شاعر تھے۔ انہیں ایک ہزار ٹنکے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔

نظام عدلیہ اور پولیس میں بھی اصلاحات نافذ کی گئیں۔

ڈاک کے نظام کو دوبارہ باقاعدہ طور پر منظم کیا گیا۔ جگہ جگہ ڈاک چوکیاں قائم کیں، گھڑسوار اور پیدل ہرکارے ڈاک کی ترسیل کے فرائض انجام دیتے تھے۔

خسرو شاہ نے اپنے بہی خواہوں کو انعام و اکرام کے طور پر جو جاگیریں عطا کی تھیں، سلطان تغلق نے وہ سب واپس لے لیں۔ اس کے علاوہ ایک عام اعلان بھی کیا گیا تھا کہ اگر ملک کافور یا خسرو خان نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے تو وہ خود دربار میں حاضر ہوکر دعویٰ دائر کرسکتا ہے۔

اس اعلان کے بعد دربار میں صبح سے شام تک اکثر ایسے چھوٹے جاگیرداروں، نوابوں اور زمینداروں کا تانتا بندھا رہتا جن کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ دعویٰ کی تصدیق اور تحقیق کے بعد ان کے دعویٰ کو تسلیم کرتے ہوئے زمین و جاگیر کی واپسی کا حکم دے دیا جاتا۔

یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک چلتا رہا اور پھر رفتہ رفتہ کمی آنے لگی۔

اُس صبح جب غیاث الدین تغلق دربار میں موجود تھا تو دوپہر تک ایک بھی اس طرح کا مقدمہ دائر نہ ہوا تھا۔

"آج تو کوئی بھی دعویدار حاضر نہیں ہوا؟" غیاث الدین تغلق نے حیرت بھری مسرت سے ملک اسماعیل کی طرف دیکھا۔

"سلطانِ معظم، ایسا لگتا ہے...... سب حقداروں کو ان کا حق مل چکا ہے، اسی لئے آج کوئی دعویدار، فریادی بن کر حاضر نہیں ہوا۔"

"یہ بات باعث اطمینان و مسرت ہے۔" تغلق نے مطمئن انداز میں گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "اس کے باوجود ہم چاہیں گے کہ دربار کے اندر اور باہر معلوم کیا جائے کہ کوئی دعویدار موجود تو نہیں ہے۔"

"جی ابھی دو خواتین دربار میں حاضر ہوئی ہیں۔" ایک خادم نے آگے بڑھ کر ملک اسماعیل کے گوش گزار کیا۔ "وہ جاگیر کے سلسلے میں سلطان کی خدمت میں عرضداشت پیش کرنا چاہتی ہیں۔"

"انہیں پیش کیا جائے۔" سلطان تغلق نے بلاتردد حکم صادر کیا اور اگلے ہی لمحے دو خواتین آگے پیچھے چلتی دربار میں حاضر ہوئیں۔ ایک عمر رسیدہ اور بے پردہ عورت تھی جو چال ڈھال اور انداز و اطوار سے خادمہ لگتی تھی جبکہ آگے والی متناسب قد و کاٹھ کی ایک چھریرے جسم کی خاتون تھی، جس نے سیاہ چادر میں خود کو سر سے پاؤں تک چھپا رکھا تھا۔ چادر کا ایک کونا چہرے پر اس انداز سے گرایا گیا تھا کہ پورا چہرہ چھپ گیا تھا۔ صرف لرزتے لب اور ٹھوڑی کا کچھ حصہ نظر آرہا تھا۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں مگر باوقار طریقے سے چلتی خادمہ کے ساتھ سلطان کے عین مقابل آٹھہری تھی۔

’’دعویٰ پیش کیا جائے۔‘‘ سلطان کے اشارے پر ایک خادم نے آگے بڑھ کر آگے والی خاتون سے کہا۔

’’دعویٰ نہیں، میں تو ایک گزارش لے کر حاضر ہوئی ہوں۔‘‘ خاتون کی دھیمی اور سریلی آواز ابھری۔ ’’سلطان معظم، ازراہِ کرم وعنایت میری درخواست قبول کر لیں تو میں تاحیات ان کی شکر گزار رہوں گی۔‘‘

’’تم کون ہو اور تمہاری درخواست کیا ہے؟‘‘ خاتون کے باوقار اور سادہ لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جس نے سلطان کو خود اسے مخاطب کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

’’میں مرحوم ملک نصرت خان کی بیٹی زرنگار بانو اور یہ میری انا خجستہ بی بی ہیں۔‘‘ لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ سلطان تغلق بھی بمشکل سن سکا تھا لیکن اس کے دائیں جانب کھڑا اس کا ولی عہد یہ تعارف سن کر چونک اٹھا تھا۔

اس نے بے ساختہ پلٹ کر زرنگار کی طرف دیکھا اور سیاہ چادر کے حلقے سے جھانکتے اس کے شنگرفی لب اور صندلی تھوڑی پہ نظر پڑتے ہی اس نے گھبرا کر اپنی نگاہ جھکا لی تھی۔

’’اور میری درخواست یہ ہے کہ بابا جان کے انتقال کے بعد ملک کافور نے اولادِ نرینہ نہ ہونے کے باعث ان کی تمام جاگیر ضبط کر لی تھی..... صرف وہ حویلی جس میں کہ میں رہائش پذیر ہوں، ایک مخصوص عرصے کے لئے عنایت کی تھی..... مگر میں چاہتی ہوں کہ یہ حویلی مستقل طور پر عمر بھر کے لئے مجھے عطا کر دی جائے اور اتنا وظیفہ عطا کیا جائے جس سے گزر بسر کی فکر سے مجھے نجات مل سکے۔‘‘

ملک نصرت خان، غیاث الدین تغلق کے دوستوں میں سے تھا۔ وہ ایک بہادر اور حق گو انسان تھا۔ اس کی اکلوتی بیٹی کو وہ آج اپنے دربار میں فریادی کی صورت دیکھ کر افسردہ ہوا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر زرنگار بھی کہ شاید وہ اپنی بات واضح طور پر بیان نہیں کر سکی، تب ہی اس نے خجستہ بی بی کو اشارہ کیا تو خجستہ بی بی آگے بڑھ کر مؤدبانہ انداز میں گویا ہوئی۔

’’سلطان معظم! ملک کافور نے کچھ مہربان امراء کی سفارش پر یہ حویلی ننھی بیگم کی شادی ہونے تک ان کی تحویل میں دی تھی مگر کیونکہ ننھی بیگم شادی کا ارادہ نہیں رکھتیں، اس لئے ان کی گزارش ہے کہ یہ حویلی ان کی زندگی تک ان کی تحویل میں دے دی جائے۔‘‘

خجستہ بی بی نے بھی دھیمی آواز اور سرگوشی بھرے لہجے میں بات کی تھی مگر کیونکہ جونا خان ان دونوں اور سلطان کے درمیانی جگہ پر ایستادہ تھا، اس لئے سلطان تک پہنچنے والی ہر بات پہلے اس کی سماعت سے گزرتی تھی۔ سو یہ بات سن کر اس کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا تھا اور یکا یک ایک غصے بھرا احساس اس کے دل میں بیدار ہوا۔

آخر وہ شادی کر کے اپنی دنیا، اپنا گھر بسا کیوں نہیں لیتی؟ میں نے اس سے کوئی اظہار یا کوئی دعویٰ، کوئی وعدہ کب کیا ہے؟ پھر وہ یکطرفہ فیصلے کی صلیب پر لٹک کر مجھے میری نظروں میں مجرم بنانے کے لئے آخر کیوں کوشاں ہے؟ کیوں وہ میرے اونچے آدرش، اعلیٰ ترین تخیلات کی راہ میں سدِ راہ بن جانا چاہتی ہے؟

لحظہ بھر کو سلطان غیاث الدین کے دل میں خیال آیا کہ وہ باندی سے سوال کرے کہ آخر اس کی مالکہ شادی کا ارادہ کیوں نہیں رکھتی.....؟ مگر بھرے دربار میں ایک کنواری لڑکی سے یہ سوال کرنا کچھ نامناسب سا لگا..... اس لئے اس نے سر جھکا کر ساتھ کھڑے وزیر دردا خان کو اشارہ کیا اور اس کے اشارے پر دائیں جانب موجود محرر نے چند ہی لمحوں میں سلطان کے حکم کو دستاویز کی شکل میں اس کے حضور پیش کر دیا۔

’’اس دستاویز میں تاحیات حویلی کی ملکیت اور وظیفے کی تفصیلات درج ہیں۔‘‘ دردا خان نے آگے بڑھ کر دستاویز خادمہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ ’’اور اس کے علاوہ بھی کبھی کوئی خدمت درکار ہو تو صاحبزادی سے گزارش ہے کہ خود دربار میں حاضر ہونے کی بجائے آئندہ کسی خادم یا خادمہ کو بھیج دیں۔‘‘

’’سلطان معظم عمرِ خضر پائیں۔‘‘ خجستہ بی بی نے دامن پھیلا کر دعا دی۔

’’یہ حقیر ناچیز بھی عمر بھر سلطان محترم اور ان کی اولاد کے لئے دعا گو رہے گی۔‘‘ اب کے زرنگار کی آواز شاید اتنی اونچی تھی کہ جونا خان کے پہلو میں کھڑے 13 سالہ فیروز خان کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ اس نے چونکتے ہوئے پلٹ کر زرنگار کی طرف دیکھا اور سیاہ چادر کی اوٹ سے جھانکتے اس کے لرزتے لب اور صبیح تھوڑی فوراً ہی پہچان لی۔

اس نے نیچی نگاہ سے جونا خان کی طرف دیکھا جو کچھ مضطرب اور اُلجھا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا اور اس کی کشادہ پیشانی پر پڑے بل اس کی اندرونی خفگی کا غماز تھے۔

زرنگار نے تو بھائی جونا خان کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا، ان کا نام بھی نہیں لیا تھا حتیٰ کہ ان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا..... پھر بھلا وہ کیونکر خفا اور ناخوش دکھائی دیتے ہیں؟ فیروز نے حیرانی سے سوچا۔ ’’صبح سے شام تک کتنے ہی فریادی آتے ہیں، آج اگر وہ آ گئیں تو بھلا حرج ہی کیا ہے؟ پھر بھائی جان..... اس قدر مضطرب کیوں نظر آ رہے ہیں؟‘‘ اس وقت وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ زرنگار کی ویران اور تنہا زندگی نا جانے کیوں جونا خان کے اندر موجود کسی جرم کا ایک بے نام سا احساس جگا رہی تھی..... اور وہ ناکردہ گناہ کے بوجھ تلے دبتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اپنی اس کیفیت پر اُسے غصہ آ رہا تھا، خود پر بھی اور زرنگار پر بھی......

زرنگار نے جھک کر پہلے سلطان تغلق کو اور پھر بالکل ہی اچانک ذرا سا ترچھا ہو کر ولی عہد سلطنت جونا خان کی خدمت میں کورنش پیش کیا تھا اور بنا پیٹھ موڑے مؤدبانہ طریقے سے واپس چل دی تھی۔ خجستہ بی بی اس کے ہمراہ تھی۔

☆......☆......☆

غیاث الدین تغلق کو برسرِ اقتدار آئے کم و بیش ایک سال ہو چکا تھا۔ ملک کے حالات پوری طرح قابو میں آ چکے تھے۔ ہر طرف امن و امان تھا۔ رعایا خوش اور مطمئن ہو کر پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ کچھ بداعمال اور بدطینت لوگ ایسے بھی تھے جو غلط روش کے عادی تھے مگر تجربہ کار سلطان کے سامنے ان کی ایک نہ چلتی تھی۔ ان میں شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر کے نام سرِفہرست تھے۔ یہ دونوں جونا خان کے مصاحبین میں شامل تھے اور موقع ملتے ہی کسی نہ کسی طریقے سے اس کے کان بھرنے لگتے تھے۔

اس شام وہ دونوں جونا خان کی نشست گاہ میں موجود تھے جبکہ جونا خان ابھی دربار سے نہیں لوٹا تھا۔ وہ اپنے بوڑھے باپ کی مدد کے لئے ہر پل، ہر لحہ، قدم بہ قدم حاضر رہتا تھا اور بڑے بڑے پیچیدہ عقدے چٹکیوں میں اپنی ذہانت اور لیاقت کے باعث حل کر دیتا تھا۔ تمام درباری اس کی ذہانت و تدبر سے بے حد متاثر تھے اور اس کی بہت عزت کرتے اور اس سے بے حد محبت سے پیش آتے تھے۔ وہ تمام درباریوں کا آنکھ کا تارا تھا۔

جونا خان دربار کے برخاست ہونے کے بعد اپنے رہائشی حصے کی طرف روانہ ہو گیا تھا۔ ولی عہد ہونے کے ناتے ایک پورا گوشہ اس کے لئے وقف تھا جہاں اس نے ایک کتب خانہ بھی بنایا تھا اور زیادہ وقت وہ پڑھنے، پڑھانے اور غور و فکر میں صرف کرتا تھا۔

وہ اپنی نشست گاہ میں داخل ہوا تو اس کے دونوں پسندیدہ اور منہ چڑھے مصاحب شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر اسے دیکھتے ہی تعظیماً کھڑے ہو گئے۔

’’شاہ زادہ عالم کی عمر بہت بڑی ہے..... ابھی ہم آپ کا ہی ذکر کر رہے تھے۔‘‘ اسے دیکھتے ہی عبید شاعر خوشامدانہ لہجے میں گویا ہوا۔

’’کچھ ہم بھی تو سنیں۔‘‘ جونا خان نے مسکرا کر دریافت کیا۔

’’ہم لوگ سوچ رہے تھے..... سلطان معظم بڑھاپے کے باعث خاصے مضطرب اور تھکن کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘ جونا خان نے حیرانی سے سوال کیا۔

’’یہی کہ..... کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ اگر سلطان معظم تخت و تاج ولی عہد کے حوالے کر کے خود آرام فرمائیں اور یادِ اللہ میں مشغول ہو جائیں۔‘‘

’’کیا بکتے ہو؟‘‘ جونا خان نے ڈپٹ کر کہا۔ ’’اللہ انہیں صحت اور زندگی دے..... تخت و تاج انہی کو زیبا ہے۔‘‘

’’جی بالکل.....‘‘ عبید شاعر ٹپٹا کر بولا۔ ’’ہم تو درباریوں کی بات کر رہے تھے..... سب آپ کو بے حد پسند کرتے ہیں..... اب ان میں سے اکثر یہ سوچنے پہ مجبور ہیں کہ سلطان چنتے وقت انہوں نے آپ کا انتخاب کیوں نہ کیا؟‘‘

’’آخر بابا جان میں کسی کو کیا نقص دکھائی دیتا ہے؟‘‘ جونا خان نے حیرت اور قدرے غصے بھرے لہجے میں سوال کیا۔

’’نہیں..... خاکم بدہن، سلطان گرامی میں کوئی نقص کیوں ہونے لگا۔‘‘ شیخ زادہ جلدی سے بولا۔ ’’وہ تو آپ کی اہلیت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے ایسا سوچنے لگے ہیں..... اور ویسے بھی آپ ولی عہد ہیں، کل کو یہ تخت و تاج آپ کے پاس ہی ہو گا۔‘‘

’’جب وہ وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا..... مگر بابا جان کی موجودگی میں اس طرح کی باتیں انتہائی لغو اور نامناسب ہیں۔‘‘

وہ دونوں شرمساری سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر جیسے کچھ اور لوگ سلطان اور سلطان زادے کے درمیان اختلافات پیدا کر کے انتشار پھیلانا چاہتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ بوڑھے سلطان کے مقابلے میں تو جوان ولی عہد کو اپنے انداز سے چلانا یقیناً آسان ثابت ہو گا..... اب سب انہی خطوط پر کام کر رہے تھے کہ کسی طرح جونا خان کو وقت سے پہلے تخت و تاج حاصل کرنے کی آرزو میں مبتلا کر سکیں۔

لیکن جونا خان ایک فرمانبردار، نیک سیرت اور والدین سے محبت کرنے والا بیٹا تھا اور ہر پل اپنے والدین کی خوشی اور اطمینان کے بارے میں فکرمند رہتا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو سامنے اپنی ماں مخدومہ جہاں کو کھڑے دیکھ کر حیرانی سے بولا۔ ’’امی جان..... آپ......؟ یہاں؟‘‘

’’ہاں، تم سے ایک ضروری کام تھا اسی لئے آنا پڑا۔‘‘

’’آپ نے زحمت کیوں کی، کام تھا تو مجھے بلا لیا ہوتا۔‘‘ جونا خان سعادت مندی سے بولا۔ ’’آیئے تشریف رکھئے۔‘‘

مخدومہ جہاں سامنے دھری کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔

’’جونا خان، تمہارے بابا جان کے چچیرے بھائی کی بیٹی زرینہ خانم کا رشتہ آیا ہے، اگر تمہیں شادی سے انکار ہے تو پھر میں تمہارے چھوٹے بھائی بہرام خان کے بارے میں سوچوں؟‘‘ مخدومہ جہاں نے بغیر کسی تمہید کے اصل مسئلے کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ’’میں اب اپنے گھر میں بہو دیکھنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’یہ تو بے حد خوشی کی بات ہے امی جان۔‘‘ جونا خان مسرور لہجے میں بولا۔ ’’آپ شوق سے بہرام خان اور ناصر خان کی شادیاں کریں..... جہاں تک میرا تعلق ہے تو آپ دیکھ رہی ہیں کہ بابا جان کس قدر مصروف ہیں، میں ان کی مدد کے لئے ہمہ وقت مستعد اور تیار رہنا چاہتا ہوں۔‘‘

مخدومہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور اگلے ہی مہینے بہرام خان کی شادی کا فیصلہ کر لیا۔

☆......☆......☆

اُس شام جونا خان اپنے استاد احمد خویش غازی کی خدمت میں حاضر تھا۔ احمد خویش غازی دانشمند اور خوش طبع شاعر تھے۔ شعر و شاعری کے سلسلے میں ہمیشہ انہوں نے جونا خان کی رہنمائی کی تھی۔ وہ ان کی دل سے عزت کرتا اور احترام و تعظیم دیتا تھا۔

استاد و شاگرد دونوں آمنے سامنے بیٹھے شعر و ادب کے حوالے سے گفت و شنید میں مصروف تھے۔ تب ہی استادِ محترم نے اپنے سامنے دھرے بے شمار کاغذوں کے پلندے سے ایک کاغذ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’اگر تم شاعری کے حوالے سے بات کرتے ہو تو میرا خیال ہے کہ یہ وصف خواتین میں بھی بہ درجہ اتم موجود ہے..... مثال کے طور پر میں تمہیں یہ ریختہ سناتا ہوں۔‘‘ احمد خویش غازی نے کاغذ جونا خان کے سامنے لہرا کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ’’یہ ریختہ اصلاح کے لئے میرے پاس بھیجی گئی ہے..... شاعرہ کا نام زرنگار بانو بنت نصرت خان ہے اور ’’تنہا‘‘ تخلص کرتی ہے۔‘‘

شاعرہ کے نام پر جونا خان چونک کر سیدھا ہو بیٹھا۔ وہ چاہتا تھا کہ احمد خویش کو وہ ریختہ سنانے سے روک دے..... وہ اس اجنبی انجان لڑکی کا ذکر تو کیا، نام بھی سننا نہیں چاہتا تھا جس کی وجہ سے بلاوجہ ہی وہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا تھا لیکن ظاہر ہے وہ استادِ محترم کو روک نہ سکتا تھا، اسی لئے سر جھکا کر ہمہ تن گوش ہو گیا۔

’’زرنگار بانو تنہا کہتی ہے۔‘‘ استادِ محترم نے ریختہ پڑھنا شروع کی۔ نہایت مرصع فارسی میں ریختہ تحریر تھی:

وہ میری آنکھوں میں ہے
ہونٹوں پر ہے
سانسوں میں ہے
دھڑکنوں میں ہے
جسم کے اطوار میں ہے
روح کے ہر تار میں ہے
مگر کیا کروں تنہا؟
وہ میری تقدیر میں نہیں ہے

’’کس قدر عمدہ خیال اور لفظوں کا کس قدر برمحل اور برموقع انتخاب و استعمال ہے، بھلا اس میں اصلاح کی کہاں گنجائش ہے۔‘‘

احمد خویش کا زرنگار کی شاعری پر تبصرہ سن کر جونا خان کا دل جل کر رہ گیا تھا۔ ’’اگر استادِ محترم گستاخی پر محمول نہ کریں تو میں کچھ عرض کروں؟‘‘

’’ہاں، ہاں ضرور۔‘‘ بوڑھے استاد نے فراخدلانہ انداز میں اجازت دی۔

’’مجھے تو یہ پوری کی پوری ریختہ ہی بے محل اور احمقانہ لگتی ہے...... جس چیز کے بارے میں پہلے سے علم ہو کہ وہ ہمارے اختیار اور تقدیر میں نہیں ہے..... اسے آنکھوں اور دھڑکنوں میں بسانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟‘‘

’’تم محبت کے اس پُل صراط سے ابھی شاید گزرے نہیں ہو شاہ زادے۔‘‘ بوڑھا استاد، نوجوان شاگرد کا چبھتا ہوا تبصرہ سن کر رسان بھرے انداز میں مسکرایا۔ ’’محبت کی نہیں جاتی، ہو جاتی ہے...... دل پر کس کا اختیار ہے۔ یہ آگ لگانے سے نہیں لگتی، از خود روشن ہو جاتی ہے اور پھر بجھانے کی لاکھ کوشش کرو، بجھائے نہیں بجھتی۔‘‘

’’استادِ محترم، کیا انسانی زندگی اتنی بے قیمت اور ارزاں ہے کہ اسے عشق و محبت کے فضول اور لاحاصل کھیل میں مبتلا ہو کر ضائع کر دیا جائے، دل و دماغ کو اس طرف راغب کر کے ان کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیا جائے..... زندگی میں اور بہت سے ضروری کام ہیں..... نہ کہ عشق و محبت کے بے سود تماشے میں شامل ہو کر خدا کی دی ہوئی صلاحیتوں کو یوں ضائع کر دیا جائے؟‘‘

بوڑھا شاعر کئی لمحوں تک نوجوان شاہ زادے کو حیرت سے تکتا رہا اور پھر دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ’’شاہ زادے، محبت سے منکر دل اس طرح کی سخت پتھریلی چٹان جیسا ہوتا ہے جس پر احساس کا کوئی پھول نہیں کھلتا، جس میں نرمی و لطافت کی کونپلیں نہیں پھوٹتیں...... ایسا سرد اور جذبات سے عاری دل..... اگر ولی عہد سلطنت کا ہو تو وہ آگے چل کر سخت گیر اور انتہا پسند سلطان ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘

اپنی بات کے آخر کے چند جملے بوڑھا استاد محض سوچ کر رہ گیا تھا، زبان پر لانے کی جرأت نہ کر سکا تھا۔

☆......☆......☆

بلا کی گرمی تھی اور غضب کا حبس تھا۔ آسمان تپ کر تانبا ہو گیا تھا۔ لو کے جھکڑ چلتے تو در و دیوار چنگاریوں کی طرح تپنے لگتے۔ ایسے گرم اور دہکتے موسم میں ایک لشکر جرار روانگی کے لئے تیار کھڑا تھا۔ لشکر کا سپہ سالار شاہ زادہ جونا خان، ماں، بہن اور دیگر خواتین سے رخصت لینے گیا ہوا تھا جبکہ فیروز خان اپنی ماں، بی بی کدبانو سے رخصت لے کر ڈیوڑھی میں پہنچ چکا تھا اور بھائی کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔ تب ہی بوڑھی انا خجستہ بی بی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی دہلیز میں داخل ہوئی تھی۔ جونا خان کے بغیر فیروز خان کو اکیلے کھڑے دیکھ کر لمحہ بھر کو خجستہ بی بی نے کچھ سوچا تھا، پھر آہستگی سے اس کی جانب بڑھ آئی اور بولی۔ ’’شاہ زادے عالم، یہ امام ضامن ولی عہد سلطان کے لئے ہے، اسے آپ ان کے بازو میں اگر باندھ دیں گے تو کسی بے قرار دل کو سکون مل جائے گا۔‘‘

عنفوانِ شباب کی وادی میں قدم رکھتے فیروز خان نے غور سے بوڑھی انا کی طرف دیکھا۔ اب وہ اس کھیل کے معنی و مطلب خوب اچھی طرح سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اسے جونا خان سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی وجہ سے اسے زرنگار سے بھی ایک اَن دیکھا سا تعلق محسوس ہونے لگا تھا کیونکہ وہ اس کی وارفتگی اور دیوانگی کو اب اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اسے اپنے چہیتے بھائی جونا خان کی بے نیازی اور تغافل پر بری طرح غصہ آتا تھا مگر وہ کچھ نہ کر سکتا تھا، وہ تو زبان پر اس کا نام اور ذکر بھی نہیں لا سکتا تھا کیونکہ اس بات کا اس نے جونا خان سے وعدہ کیا تھا۔ سو آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس نے امام ضامن تھام لیا۔

’’ان کی دعا ہے کہ شاہ زادہ عالم بخیر و عافیت اور کامیابی کے ساتھ واپس لوٹیں۔‘‘ خجستہ بی بی نے امام ضامن کے ساتھ دعائیہ پیغام بھی دیا اور واپسی کے لئے پلٹ گئی۔

جونا خان زنان خانے سے نکل کر باپ سے رخصت لینے ایوانِ خاص کی طرف روانہ ہو گیا جبکہ زرنگار کا بھیجا ہوا امام ضامن فیروز خان کے لباس کی جیب میں پڑا اپنے مطلوب کے بازو کا منتظر تھا۔

سلطان غیاث الدین تغلق کی نصیحتیں، دعائیں اور محبتیں لے کر جونا خان رخصت ہوا اور لشکر ورنگل کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان تغلق نے اندرونی امن و امان قائم کرنے کے بعد سلطنت کو وسیع کرنے کے خیال سے سب سے پہلے دکن کی طرف توجہ کی تھی۔

علاؤالدین خلجی کے آخری دور میں مملکت کے مختلف صوبوں میں بغاوت کے آثار نمودار ہوتے دیکھ کر تلنگانہ کے کاکت خاندان کے حکمران راجہ پرتاب رودرا نے خراج دینا بند کر دیا تھا۔ چنانچہ سلطان تغلق نے راجہ پرتاب کو سبق سکھانے کی غرض سے جونا خان کو لشکر دے کر تلنگانہ کی مہم پر روانہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا..... اور آج جونا خان ایک لشکر جرار لے کر تلنگانہ کے لئے رواں دواں تھا۔

راجہ، جونا خان کی آمد کی خبر سن کر اپنی فوج لے کر نکلا اور ورنگل سے دس فرلانگ اس جانب سہواتی گھاٹ کے میدان میں صف آرا ہوا۔ اگلے دن عصر و مغرب کے درمیان معرکے کا آغاز ہوا۔ راجہ کی افواج بھی خوب جم کر لڑیں اور غروبِ آفتاب تک دونوں جانب کے سیکڑوں لشکری مقتول ہوئے۔

اگلے دن نمازِ فجر کے بعد جونا خان نے اپنی افواج کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی جس نے ایک ایک سپاہی کے دل میں جوش بھر دیا اور اب کے جو معرکہ ہوا تو وہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ راجہ پرتاب اپنے پایۂ تخت ورنگل کے قلعے میں محصور ہو گیا۔

جونا خان نے آگے بڑھ کر قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعے کی برج اور فصیلیں بے حد اونچی اور مستحکم تھیں، اس طرف پیش نہ چلتے دیکھ کر جونا خان نے دمدمہ اور سرنگ کھودنے کا ارادہ کیا۔ اِدھر یہ کام جاری تھا، اُدھر روز راجہ کے لشکر کے سپاہی قلعے سے نکل کر جونا خان کی فوج پر بلّہ بولتے۔

اس صورت حال نے جونا خان کو فکرمند کر دیا۔ ایسے میں سلطنت دہلی کے بدخواہوں عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی نے شاہ زادے کو واپسی کا مشورہ دینا شروع کر دیا مگر جونا خان اپنے فیصلے پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس نے ورنگل کو سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بنانے کا فیصلہ کیا تھا اور اب وہ سرنگ کے مکمل ہونے کا منتظر تھا۔

جونا خان کی شجاعت اور ولولے کو دیکھتے ہوئے آخرکار راجہ کو گھٹنے ٹیکنے ہی پڑے..... اس نے زر و جواہر، ہاتھی، گھوڑے اور ساتھ ہی خراج دینے کی پیشکش کی لیکن جونا خان راضی نہ ہوا۔

موسم برسات کے شروع ہو جانے کے باعث موسلادھار بارشوں کی وجہ سے میدانِ جنگ نے تالاب کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ سپاہ نے پتھر جمع کر کے ایک اونچا چبوترہ قائم کر کے جونا خان کا خیمہ اس پر ایستادہ کیا۔ باقی خیمے پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ناسازیٔ آب و ہوا کے باعث ہیضے کی وباء پھوٹ نکلی۔ کچھ بیماریاں سپاہ کے علاوہ ہاتھی، گھوڑوں پر بھی اثرانداز ہوئیں اور بے شمار ہاتھی، گھوڑے بھی لقمۂ اجل بنے۔

پانی اور سیلاب کے باعث دہلی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہر روز سیکڑوں لشکری موت کا شکار ہو رہے تھے۔ یہاں کی کوئی خبر وہاں اور وہاں کی کوئی خبر یہاں نہ آتی تھی۔

جونا خان اس صورت حال کے علاوہ دلّی سے رابطہ ٹوٹ جانے کے باعث بھی بے حد متفکر و متوحش تھا کہ اچانک عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی اس کے خیمے میں داخل ہوئے۔

(جاری ہے)

"شاہ زادہ عالم، ایک بُری خبر ہے۔" عبید نے سوکھا سا منہ بنا کر کہا۔ "ابھی ابھی دِلّی سے قاصد یہ خبر لایا ہے...... میرے منہ میں خاک...... سلطان تغلق کا انتقال ہوگیا ہے اور دِلّی میں بغاوت پھیل گئی ہے اور تختِ دِلّی پہ کوئی علائی شخص قابض ہو گیا ہے۔"

"کیا کہہ رہے ہو عبید؟" شاہ زادہ حیرانی اور بے یقینی سے بولا...... "ایسا کیونکر ممکن ہے؟"

سلطان محمد تغلق

اشتیاق قاسم عظمی

قسط : 8

"مگر شاہ زادے، ایسا ہو چکا ہے۔" دمشقی نے تائید بھرے انداز میں سر ہلاتے ہوئے پُر یقین لہجے میں جواب دیا اور شاہ زادہ قریب دھری کرسی پر ہارے ہوئے جواری کی طرح دھپ سے بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ناہنجار مصاحب اس پر بجلی گرا کر واپس جا چکے تھے اور اُسے اپنا سر گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔

عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی یہاں سے فارغ ہو کر لشکر کے چاروں بڑے سرداروں ملک تیمور، ملک گل افغان، ملک کافور مہردار اور ملک تگین کے پاس گئے۔

"آپ لوگوں کے لئے ایک انتہائی بُری خبر ہے۔" عبید شاعر نے بات کا آغاز کیا۔ "وہ یہ کہ سلطان کا انتقال ہوگیا ہے۔ دِلّی میں بغاوت پھیل گئی ہے اور ایک علائی شخص تخت پر قابض ہوگیا ہے۔" اُس نے دم بھر کو رک کر ان چاروں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ وہاں حیرت اور بے یقینی کے سوا کچھ نہ تھا۔

"یہاں تک تو ٹھیک ہے...... پر اب آگے کی سنو۔" دمشقی آگے بڑھا اور ڈرامائی انداز میں گویا ہوا۔ "کیونکہ آپ سب کا خاندان علائی سے تعلق ہے، اس لئے شاہ زادے جونا خان نے اپنے وفادار سپاہیوں کو حکم دیا ہے کہ وہ آپ چاروں کو گرفتار کر کے قتل کر دیں۔"

"کیا بکتے ہو؟" ملک ڈپٹ کر بولا۔ "شاہ زادہ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"خبر دینا ہمارا کام تھا، وہ دے دی، اب آپ مانیں یا نہ مانیں، یہ آپ کا کام ہے، ہم تو رخصت ہوتے ہیں۔"

ان دونوں کے جانے کے بعد وہ چاروں حیران پریشان ایک دوسرے کا چہرہ دیکھنے لگے...... ان کی آنکھوں سے سراسیمگی عیاں تھی۔

"ہمیں اپنے اپنے دوستوں کو مطلع کر دینا چاہئے۔" کچھ دیر بعد ملک کافور مہردار نے کہا اور وہ چاروں خیمے سے نکل کر لشکر کی طرف دوڑ پڑے۔

اس خبر کے پھیلتے ہی لشکر میں عظیم فتنہ جاگ اٹھا اور جدھر جس کے سینگ سمائے، مفرور ہوا۔

حالات کی اس کروٹ نے جونا خان کو ہراساں کر دیا تھا۔ اس کے سردار اس سے باغی ہو چکے تھے۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔ ایسے میں فیروز خان ہاتھ میں ایک امام ضامن لے کر اس کی جانب بڑھا۔

"یہ کیا ہے؟" جونا خان نے متوحش لہجے میں پوچھا۔

"یہ آپ کی حفاظت کے لئے آپ کے کسی بہی خواہ نے بھیجا تھا۔" فیروز خان نے وہ امام ضامن جونا خان کے بازو پر باندھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "پہلے میں اسے باندھ نہ سکا تھا مگر اب اس کا باندھنا ناگزیر ہے کیونکہ یہ امام ضامن کسی بے قرار دل سے نکلی دعاؤں کی گرہوں سے بندھا ہے۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں، یہ کس کی طرف سے ہے؟" جونا خان نے بازو پہ بندھے امام ضامن کی طرف دیکھ کر فیروز خان سے سوال کیا۔

"میں معذرت چاہتا ہوں کیونکہ میں پہلے ہی اس ہستی کا نام زبان پہ نہ لانے کا آپ سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

اس سے قبل کہ وہ فیروز خان سے کوئی سوال کرتا، اس کے دو وفادار ساتھی افتخار خان اور ملک سودا خان خیمے میں سرعت سے داخل ہوئے۔

"شاہ زادے، خیمے کے چبوترے کے پچھلی جانب گھوڑے تیار کھڑے ہیں، آپ اور فیروز خان ان پر سوار ہو کر میدان سے نکلئے، شہر کی فصیل کے باہر ہم بھی آپ سے آملیں گے۔"

جونا خان، فیروز خان کا ہاتھ تھام کر خیمے سے نکلا اور تیزی سے گھوڑے پر سوار ہوگیا۔ فیروز کو اس نے اپنے پیچھے ہی سوار کر لیا تھا۔ اس کے ساتھ چند اور وفادار بھی شامل ہو گئے تھے۔ وہ سب تیز رفتاری سے دیوگڑھ کی طرف روانہ ہو گئے۔

جونا خان کے فرار کی خبر ملتے ہی راجہ پرتاب رودرا دوم نے قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس کی تازہ دم فوج لشکر پر ٹوٹ پڑی۔ بچے کھچے لشکری جان بچا کر بھاگے مگر راجہ کے سپاہیوں نے تلنگانہ کی سرحد تک ان کا پیچھا کیا۔

چند سردار جو اپنے دستے لے کر پہلے نکل گئے تھے، وہی زندہ بچ سکے۔ باقی لشکر کچھ وبا اور موسم کی سختی کے باعث اور کچھ راجہ کی فوج کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتر گیا۔

جونا خان نے ایک کارندہ دہلی کی خبر لانے کو روانہ کیا، جس نے دیوگڑھ پہنچتے تک سلطان تغلق کی سلامتی اور خیر و عافیت کی خبر بہم پہنچائی، جسے پا کر جونا خان کی جان میں جان آئی اور دیوگڑھ میں اس نے از سرِ نو لشکر تشکیل دینا شروع کیا۔

وہ چاروں سردار جو شروع میں ہی لشکر سے نکل بھاگے تھے، ان کا انجام بھی کچھ اچھا نہ ہوا۔ ملک تیمور، تلنگانہ میں طبعی موت مر گیا جبکہ ملک تگین کو ہندو مرہٹوں نے قتل کر کے اس کی لاش جونا خان کو بھجوا دی۔

ملک گل افغان، ملک کافور، عبید شاعر اور شیخ زادہ دمشقی کو گرفتار کر کے جونا خان کے روبرو لایا گیا۔ اس نے انہیں قید کر کے دہلی کی طرف روانہ کیا، جہاں غیاث الدین تغلق نے انہیں زندہ درگور کر دینے کا حکم صادر فرمایا اور ان کے اہل و عیال جو دِلّی میں مقیم تھے، انہیں بھی ہاتھیوں کے ذریعے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

جونا خان، دیوگڑھ میں چار ہزار کا لشکر تیار کر کے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ شہر کے دروازے پر غیاث الدین تغلق بہ نفسِ نفیس خود موجود تھا۔ وہ اپنے لختِ جگر کو زندہ سلامت پا کر خوشی سے نہال ہو اٹھا۔ بے ساختہ آگے بڑھ کر اس نے جونا خان کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ جونا خان بھی باپ کو زندہ سلامت دیکھ کر مسرور ہوا۔ دونوں کتنی دیر ایک دوسرے کے سینے سے لگے بے کل دھڑکنوں کو آسودگی بخشتے رہے۔

الگ ہوتے وقت سلطان کا ہاتھ جونا خان کے بازو پر بندھے امام ضامن پر پڑ گیا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے بے ساختہ سوال کیا۔

"یہ امام ضامن ہے۔" جونا خان نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔ "شاید اسی کی برکت سے آج آپ مجھے صحیح سلامت دیکھ رہے ہیں۔" یہ بات وہ سوچ کر رہ گیا تھا اور اس سوچ کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں بے ساختہ زرنگار کا خیال جاگ اٹھا...... پہلی بار اس خیال سے اُسے کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک موہوم سا تبسم اس کے لبوں پر بکھر گیا تھا۔

فیروز خان حیران نظروں سے اس کے ہونٹوں پہ بکھری مسکراہٹ کی روپہلی دھوپ دیکھ رہا تھا۔

☆......☆......☆

تلنگانہ میں لشکر کی تباہی اور ذلت کے ساتھ شکست خوردہ واپسی نے جونا خان کے دل پر ایک داغ بنا دیا تھا اور وہ اذیت کے اس داغ کو فتح کے پانی سے دھونے کا آرزومند تھا۔ چنانچہ چند ماہ بعد اس نے باپ سے دوبارہ تلنگانہ فتح کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ خود سلطان بھی یہی چاہتا تھا۔ سو اس نے ایک بڑا لشکر تشکیل دینا شروع کیا۔

وقت آہستہ روی سے گزر رہا تھا۔ جونا خان کو جب موقع ملتا، وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضری دینے پہنچ جاتا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ اس سے خاص اُنسیت و محبت رکھتے تھے اور وہ بھی دل سے ان کا معتقد تھا۔ وہ ہر نئے کام کو شروع کرنے سے پہلے ان سے مشورہ کرنا ضروری سمجھتا تھا، چنانچہ تلنگانہ کی جانب دوبارہ روانگی سے قبل اس نے حضرت خواجہؒ سے دعا کی درخواست کی۔

"اللہ پر بھروسہ رکھو۔" حضرت نظام الدین اولیاؒ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "انشاء اللہ فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی سلطان معظم۔"

جونا خان کا دل چاہا، وہ ان سے پوچھے وہ ہمیشہ اُسے "سلطان" کیوں کہتے ہیں؟ مگر وہ یہ سوال نہ کر سکا۔ ادب مانع آ گیا تھا۔

1323ء کو جونا خان لشکر لے کر ایک بار پھر تلنگانہ کی طرف روانہ ہوا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی دعا یقین بن کر اس کے دل میں دھڑک رہی تھی۔ وہ پورے اعتماد کے ساتھ تلنگانہ پر حملہ آور ہوا۔ راجہ کی افواج نے سخت جانی سے مقابلہ کیا۔ کئی روز تک جنگ جاری رہی۔ آخرکار انہیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ جونا خان نے راجہ کو اس کے خاندان سمیت گرفتار کر کے دہلی روانہ کر دیا اور خود کچھ عرصے وہیں ٹھہر گیا۔

اس جنگ کے نتیجے میں بے اندازہ مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔ تلنگانہ کو سلطنت دہلی میں شامل کر لیا گیا۔ ورنگل کا نام بدل کر "سلطان پور" رکھ دیا گیا اور اسے بھی سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بنا دیا گیا اور وہاں ایک مسلمان صوبیدار مقرر کیا گیا۔

جونا خان نے دہلی واپس آتے ہوئے اڑیسہ کی انگل حکومت پر حملہ کیا۔ یہاں سے بھی کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا اور یوں فتح و نصرت کے شادیانے بجاتا جونا خان دہلی پہنچا۔ اس کی آمد اور فتح کی خوشی میں دہلی میں جشن کا سا سماں تھا۔ کئی روز تک غرباء میں کھانا اور کپڑے تقسیم کئے جاتے رہے۔

ان فتوحات نے سلطان تغلق کا وقار کچھ اور بلند کر دیا تھا۔ گو کہ بدخواہ اب بھی موجود تھے مگر انہیں اب زبان کھولنے کی جرأت نہ تھی مگر جب بھی موقع ملتا، وہ سلطان کے کان بھرنے سے باز نہ آتے تھے۔ انہی بدخواہوں میں ایک ملک لکھی بھی تھا۔ شراب پینا اور جوا کھیلنا اس کے محبوب مشاغل میں سے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار جب وہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر حاضر ہوا تو انہوں نے اسے واپس بھیج دیا تھا۔ ولی عہد جونا خان کے سامنے اپنی یہ تذلیل اُسے سخت ناگوار گزری تھی۔

اُسے گمان ہوا کیونکہ ولی عہد سلطنت، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے سامنے حاضر رہتا ہے، شاید اسی وجہ سے حضرت نظام الدین اولیاؒ اس کی بڑائی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا، وہ سلطان کے کان حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلاف بھر کر انہیں تکلیف پہنچائے گا۔

اس شام دربار کا خصوصی اجلاس منعقد تھا۔ سلطان نے اس وقت دربار بنگال کے حالات پر غور کرنے کے لئے بلایا تھا۔ تمام امراء و وزراء دربار میں موجود تھے۔ ملک لکھی بھی سر جھکائے کونے میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

بنگال میں بلبن کے بیٹے بغرا خان کے زمانے سے صوبیداری موروثی ہو گئی تھی لیکن یہ صوبیدار سلطانِ دہلی کی قیادت تسلیم کرتے تھے۔ خطبہ اور سکہ سلطان دہلی کے نام کا چلتا تھا۔ بغرا خان کے بیٹے شمس الدین کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے مابین جانشینی کے لئے کشمکش شروع ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک بیٹے ناصر الدین نے سلطان غیاث الدین تغلق سے مدد کی درخواست کی تھی۔

"اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے ملک اسماعیل؟" سلطان تغلق نے امیر سے سوال کیا۔

"میرا خیال ہے کہ آپ جو کچھ سوچ رہے ہیں، ان حالات میں وہی درست ہے۔"

ملک اسماعیل کے جواب سے سلطان غیاث الدین تغلق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

جونا خان کا خیال تھا کہ اس بار بھی اسے ہی لشکر کشی کا موقع دیا جائے گا مگر اس بار سلطان نے خود بنگال جانے کا فیصلہ کیا۔ سلطان کے فیصلے سے ولی عہد کے چہرے پر مایوسی کا رنگ بکھر گیا۔ ملک لکھی بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

دربار کے برخاست ہونے کے بعد ملک لکھی، سلطان کے ساتھ اس کے ایوانِ خاص میں چلا آیا۔

"ملک لکھی، کچھ کہنا چاہتے ہو؟" اسے کشمکش میں مبتلا پا کر سلطان غیاث الدین تغلق نے سوال کیا۔

"اللہ نے سلطان معظم کو روشن دماغ عطا کیا ہے، جسے علم و آگاہی کی روشنی نے مزید چار چاند لگا دیئے ہیں۔ میں اپنی جہالت کے طفیل ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔" ملک لکھی نے چاپلوسی بھرے انداز میں کہا۔

"پوچھو کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" سلطان نے رسان بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"سرکار، راگ رنگ، قوالی، محفلِ سماع، کیا اسلام میں جائز ہے؟"

"راگ رنگ تو نہیں البتہ حمدیہ، نعتیہ اور صوفیانہ کلام جائز ہے۔" سلطان نے جواب دیا۔

"ڈھول، تاشے، طبلے، تالی کے ساتھ قوالی اور قوالی پر حال و دھمال بھی جائز ہے؟" ملک لکھی نے پھر سوال کیا۔

"نہیں یہ سب باتیں ناجائز اور فضول ہیں۔" سلطان نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "حال و مثال، رقص و دھمال، غیر اسلامی اور غیر شرعی ہے، اس کی قطعی اجازت نہیں ہے۔"

"مگر سرکار، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے آستانے پر تو روز یہ تماشا ہوتا ہے۔" ملک لکھی اب اصل مقصد کی جانب آیا۔ "طبلے کی تھاپ پر قوال سُر ملاتے ہیں، تالی پیٹی جاتی ہے اور لوگ بدمست ہو کر ناچنے لگتے ہیں۔"

"میرا خیال ہے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" سلطان نے کہا۔ "شاہ زادہ جونا خان وہاں اکثر جاتا ہے، اس نے تو کبھی ایسی کوئی بات نہیں بتائی۔"

"وہ کیوں بتانے لگے۔" ملک لکھی نے دل جلے لہجے میں کہا۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے ولی عہد کا دل مٹھی میں لیا ہوا ہے۔ وہ تو اُسے "سلطان ہند" کہہ کر مخاطب کرتے ہیں اور شاہ زادے کے سامنے بھی محفلِ سماع جاری رہتی ہے...... اکثر وہ بھی جھومنے لگتے ہیں، بس اٹھ کر دیوانہ وار چکرانے کی کسر باقی رہ جاتی ہے۔"

"لاحول ولاقوۃ......" سلطان کی پیشانی پر ناگواری کی لکیریں کھنچ گئیں۔ "اگر یہ سب درست ہے تو حضرت نظام الدین اولیاؒ کو کہلوا دو کہ دربار میں حاضر ہو کر اپنے ان تمام غیر شرعی اعمال کی معافی مانگیں اور آئندہ ایسے عمل سے باز رہیں۔"

"جو حکم سلطان معظم......" ملک لکھی کے چہرے پر مسرت بکھر گئی۔

وہ وہاں سے نکل کر سیدھا جونا خان کی نشست گاہ میں پہنچا۔ اس وقت جونا خان اپنی نشست پر اُداس اور خاموش بیٹھا تھا۔ بنگال کی مہم پر اسے نہ بھیجا جانا اس کے لئے تاسف و ملال کا باعث بنا تھا۔

"شاہ زادۂ عالم، کچھ متفکر دکھائی دیتے ہیں۔" وہ خاموشی سے اس کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی آواز پر جونا خان نے چونک کر سر اٹھایا۔

"نن...... نہیں بھلا فکر و تردد کی کیا بات ہو سکتی ہے؟"

"وہی تو میں پریشان ہو رہا تھا کہ اصل بات تو آپ تک پہنچی نہیں، آپ پہلے سے فکرمند ہو گئے۔" ملک لکھی نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ "کچھ خبر بھی ہے، بدخواہوں نے سلطان معظم کے، حضرت نظام الدین اولیاؒ کے خلاف کان بھرے ہیں۔"

"کیا مطلب؟" جونا خان چونک کر سیدھا ہوتا ہوا بولا۔

"مطلب یہ کہ ان کے آستانے پہ ہونے والی محافلِ سماع کے حوالے سے سلطان محترم کو یہ باور کروایا گیا ہے کہ ڈھول، تاشے، طبلے اور تالی پر گانا، جھومنا اور مست ہو کر دھمال ڈالنا سب غیر شرعی ہے۔" ملک لکھی نے تفصیلاً جواب دیا۔

"اوہ...... پھر بابا جان نے کیا کہا؟" جونا خان نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"انہوں نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کو دربار میں حاضر ہونے اور تمام غیر شرعی اعمال فوری طور پر بند کرنے کا حکم صادر فرمایا ہے۔" ملک لکھی کے جواب پر مضطرب ہو کر جونا خان بولا۔

"ملک لکھی، حضرت نظام الدین اولیاؒ کو یہ سب سخت ناگوار گزرے گا...... کسی طرح بابا جان کے اس حکم کو ان تک پہنچنے سے روکنا ہوگا۔"

"سلطان معظم کے حکم کو تعمیل سے روکنا حکم عدولی اور گستاخی ہوگا شاہ زادے۔ اتنی ہمت کون کر سکتا ہے اور اب تک تو پیغام جا بھی چکا ہوگا۔"

☆......☆......☆

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے سلطان کا پیغام، پیغام بر کی زبانی سنا۔ ان کے پُرجلال اور پُروقار چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا...... انہوں نے آنکھیں کھول کر قاصد کی طرف دیکھا اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں...... ان کے پُرسکون چہرے پہ ایک موہوم سا تبسم پھیل گیا۔

☆......☆......☆

پیغام بر جواب لے کر جب سلطان کے حضور پہنچا تو حضرت نظام الدین اولیاؒ کی بے نیازی اور اہمیت نہ دینے کی وجہ سے ملک لکھی کے سینے میں آگ سی لگ گئی تھی۔

"دیکھا حضور والا...... دربار میں حاضر ہونا تو درکنار، انہوں نے جواباً ایک لفظ کہنا بھی ضروری نہ سمجھا...... یہ سراسر گستاخی ہے۔"

"پیغام بر سے کہو وہ وہاں جا کر دربار میں حاضر ہونے کے بارے میں ان کا جواب لے کر آئے۔" سلطان نے کمالِ ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں حکم دیا۔

"بھلا فقراء کا درباروں میں کیا کام؟" خواجہ نظام الدین اولیاؒ نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "سلطان سے کہو، وہ اپنا کام کرے...... ہم فقیروں کے کام میں دخل نہ دے...... شاہ و گدا کا بھلا ایک دوسرے سے کیا تعلق۔"

بھرے دربار میں جب پیغام بر نے حضرت نظام الدین اولیاؒ کا یہ پیغام سنایا تو سلطان کی پیشانی پر سلوٹیں سمٹ آئیں۔

"بابا جان، حضرت نظام الدین اولیاؒ برگزیدہ بندے ہیں۔" جونا خان نے آگے بڑھ کر کچھ کہنا چاہا۔

"ان کی اتنی ہمت اسی لئے ہوئی ہے کہ انہیں تمہاری حمایت حاصل ہے۔" سلطان نے تلخی سے کہا۔ "بہتر ہوگا شاہ زادے کہ اس معاملے سے تم الگ رہو۔"

دربار میں جونا خان کی بڑی عزت و تکریم تھی۔ بوڑھے اور عمر رسیدہ امراء تک شاہ زادے کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اپنی علمی قابلیت، لیاقت اور خداداد صلاحیت میں وہ اپنے باپ سے کہیں آگے تھا۔ جن لوگوں کو یہ ادراک تھا، وہ اسے سلطان سے زیادہ اہمیت دیتے تھے مگر اس وقت سب کے سامنے سلطان کا ترش اور کڑوا لہجہ جونا خان کے لئے شرمندگی کا باعث بن گیا تھا۔ اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

گو کہ وہ ایک فرمانبردار اور باپ کی عزت کرنے والا اور اس سے محبت رکھنے والا بیٹا تھا۔ خود سلطان غیاث الدین تغلق بھی اسے اپنے دوسرے بیٹوں کے مقابلے میں زیادہ چاہتا تھا مگر اس وقت باپ کا یہ توہین آمیز لہجہ پھانس کی طرح اس کے دل میں چبھ گیا تھا۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ دربار میں حاضر ہوئے اور نہ ہی ان کے یہاں منعقد ہونے والی محافلِ سماع بند ہوئیں۔

سلطان بنگال کی مہم پر روانگی کی تیاریوں میں لگا ہوا تھا۔ اس مصروفیت کے باعث یا پھر اس روز جونا خان کے کہنے کے خیال سے دوبارہ اس نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے معاملے پر توجہ نہ دی تھی۔

ملک لکھی کے ایک آدھ بار اُکسانے پر اس نے جواب دیا تھا۔

"بنگال سے واپس لوٹنے کے بعد اس طرف توجہ دی جائے گی۔"

ملک لکھی بظاہر خاموش ہو گیا تھا مگر وہ خاموش بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس کے ساتھ اس جیسے چند لوگ اور بھی شامل تھے جن میں ایک ولی نعمت خان بھی تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جن کی خسرو خان اور ملک کافور کی حکومت کے ختم ہوتے ہی رنگ رلیاں ختم ہو گئی تھیں چنانچہ وہ



تغلق حکومت کے سخت خلاف تھے۔ ان میں سے کچھ کا خیال تھا کہ تجربے کار سلطان کی نسبت نوجوان ولی عہد کو چاپلوسی، خوشامد اور لاگ لپیٹ سے بے وقوف بنا کر اپنی مرضی کے مطابق چلانا یقیناً آسان ہوگا۔

شیخ زادہ دمشقی اور عبید شاعر بھی اسی ٹولے کے افراد تھے۔ ان کی عبرتناک موت اور ان کے خاندان کا نیست و نابود کیا جانا بھی اس ٹولے کے سینے میں انتقام کی آگ سلگائے ہوئے تھا۔ بظاہر وہ سلطان اور سلطان زادے کے بہی خواہ اور مصاحب تھے مگر درحقیقت وہ حکمران اور حکومت کے بدترین بدخواہ تھے اور کسی بھی طرح ولی عہد شاہزادے جونا خان اور سلطان غیاث الدین تغلق کے مابین دوری اور بُعد پیدا کرنا چاہتے تھے۔

"سلطان کے جواب نے شاہزادے کے دل میں رنجش پیدا کی ہے۔" ملک لکھی، ولی نعمت خان سے کہہ رہا تھا۔ "اب یہ تمہارا کام ہے کہ اس رنجش کو نفرت اور انتقام کے جذبے میں کس طرح بدلتے ہو؟"

"تم جانتے ہو یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ جونا خان ایک نیک طینت اور صالح بیٹا ہے...... اُسے باپ کے خلاف بھڑکانا ناممکن نہیں، تو بے حد مشکل ضرور ہے۔" ولی نعمت خان نے پُرسوچ لہجے میں جواب دیا۔

"تمہارے پاس بہت سے طریقے ہیں جن سے اس چنگاری کو بھڑکا کر شعلہ بنایا جا سکتا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم رائی کا پہاڑ کیسے بناتے ہو؟...... میں تو سلطان کے ساتھ مہم پر روانہ ہو رہا ہوں، وہاں کے معاملات میں سنبھالے رکھوں گا اور یہاں کی آگ تمہیں روشن رکھنی ہے بلکہ جلتی پہ تیل ڈال کر الاؤ میں بدلنا ہے۔"

سلطان غیاث الدین تغلق کی حکومت کو چار سال پورے ہو کر پانچواں سال لگ چکا تھا۔ ان چار سالوں میں قدم قدم پر جونا خان نے اس کا ساتھ دیا تھا اور ہر ہر پل اس کی مدد اور دست گیری کے لئے حاضر رہا تھا۔ حکومتی امور میں مصروف رہنے کے باعث اس نے گھر گرہستی کی ذمے داری سے بھی اجتناب برتا تھا۔ وہ اب تک غیر شادی شدہ تھا جبکہ اس کے بعد کے تینوں بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ مخدومہ جہاں بھی کہہ کہہ کر اب تھک چکی تھی۔ اب اس نے مستقل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ اس کی بیٹی خداوندزادہ اب چودہ برس کی ہونے کو آئی تھی...... آج کل وہ اسی کی شادی کی فکر میں تھی۔

دوسری طرف فیروز خان بھی اب اٹھارویں برس میں لگ گیا تھا چنانچہ اس کی ماں بی بی کدبانو کی خواہش تھی کہ اس کے سر پر بھی سہرا سجا دیا جائے مگر فیروز خان اپنے سے زیادہ جونا خان کے بارے میں فکرمند رہتا تھا۔ جان سے زیادہ تایازاد بھائی کا اکیلا پن اس کے دل میں چٹکیاں لیا کرتا تھا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں تھا جہاں وہ برسوں پہلے اس شام کو دالان کی تنگ سیڑھیوں پہ زرنگار کے کہے گئے جملوں کو نہ صرف سمجھ سکتا تھا بلکہ تجزیہ بھی کر سکتا تھا اور پھر تلنگانہ کی مہم کی روانگی کے وقت اُس کے ہاتھ بھیجا گیا وہ امام ضامن زرنگار کی محبت اور وارفتگی کا بیّن ثبوت تھا۔

مگر جونا خان محبت کے اس احساس سے محروم تھا۔ اس کے نزدیک شادی، بیوی، بچے سب غیر اہم اور غیر ضروری تھے۔ اس کے نزدیک ان کاموں سے کہیں زیادہ اہم اور ضروری حکومتی امور تھے جن کی خاطر اس نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

☆......☆......☆

رات سفر کرتی آخری پہر میں داخل ہو چکی تھی۔ چاندنی دھندلا گئی تھی۔ ہواؤں میں آغازِ صبح کی نرمی اور لطافت جاگ اٹھی تھی۔

فانوسوں میں پگھلتی شمعیں اختتام پذیر ہونے کو تھیں۔ شمعوں کی دم توڑتی مدھم روشنی میں صبح کاذب کا دھندلا سا اُجالا گھلتا جا رہا تھا۔ اُدھ کھلے دریچوں سے آنے والی ہوا سے چھپرکھٹ کے مہین پردے دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔ مخملیں سرہانے پر سر دھرے سلطان دہلی غیاث الدین تغلق گہری نیند سو رہا تھا لیکن اس کی شریکِ حیات مخدومہ جہاں اب تک جاگ رہی تھی۔ آج اس کے جیون کا ساتھی، اس کے سر کا تاج بنگال کی مہم پہ روانہ ہونے والا تھا۔ سلطان کی زندگی کی یہ پہلی جنگ نہ تھی۔ اس طرح کی کتنی ہی جنگوں میں فتحیاب ہو کر اس نے "غازی ملک" کا خطاب حاصل کیا تھا مگر پھر بھی اس بار مخدومہ جہاں کے دل میں ایک عجیب سی بے کلی تھی۔ وہ اس کی بگڑتی ہوئی صحت کی وجہ سے متفکر تھی اور اس کا خیال تھا کہ اس مہم پر خود جانے کی بجائے جونا خان کو روانہ کرنا چاہئے تھا۔

جونا خان کی بھی یہی خواہش تھی اور اس خواہش کے تشنہ رہ جانے کے باعث اس کے دل میں ہلکا سا ملال تھا۔ اس بات کا مخدومہ کو اندازہ تھا۔ دوسری جانب سلطان اپنے اس دن کے رویّے سے خاصا افسردہ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ بھرے دربار میں اس کی خفگی نے جونا خان کو شرمسار و پشیمان کر دیا تھا۔

مخدومہ جہاں نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ اس کی کلائیوں میں پڑے کنگن کھنک اٹھے۔ اس آواز پر تغلق نے بے ساختہ آنکھیں کھول دی تھیں۔

"آپ جاگ گئے؟" مخدومہ جہاں نے سوال کیا۔

"مگر لگتا ہے کہ تم سوئی ہی نہیں۔" غیاث الدین اٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں، دراصل میں آپ کی روانگی اور جونا خان کی وجہ سے کچھ فکرمند ہوں۔" مخدومہ جہاں نے بغیر کسی پس و پیش کے سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے جواب دیا۔

"تم جانتی ہو بنیادی طور پر میں ایک سپاہی ہوں۔" بیوی کا رنجیدہ چہرہ دیکھ کر سلطان نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "اور ایک سپاہی کی اصل منزل میدانِ جنگ ہوتی ہے اور یہ کوئی میری زندگی کی پہلی مہم نہیں ہے...... تم اس طرح کی مہموں میں فاتحانہ انداز میں واپسی کی عادی ہو۔"

"مجھے اپنے ربِ کریم سے یہی امید ہے کہ وہ آپ کو فتح و نصرت کے ساتھ اس بار بھی کامیاب و کامران لوٹائے گا۔" مخدومہ جہاں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"اور رہا سوال جونا خان کا......" سلطان کے لہجے میں ہلکا سا پچھتاوا سمٹ آیا۔ "مجھے خود اپنے اس دن کے لہجے پر ملال ہے...... مجھے لگتا ہے جونا خان اس دن کے بعد سے...... مجھ سے کچھ خفا سا ہے۔"

"آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟" مخدومہ جہاں جلدی سے بولی۔ "آپ کے بیٹوں میں وہ سب سے زیادہ سمجھدار، صاحبِ ادراک اور صالح بیٹا ہے...... اُس نے تو آپ کے لہجے کو محسوس بھی نہ کیا ہوگا...... وہ باپ کے اونچے منصب سے واقف ہے...... اگر اس کے باوجود آپ ایسا کچھ سوچتے ہیں، تو میں خود اس سے بات کر کے آپ کی طرف سے اس کا دل صاف کر دوں گی۔"

"شکریہ بیگم۔" غیاث الدین نے تشکر بھری نظروں سے چہیتی بیوی کی طرف دیکھا۔ شروع سے آج تک یہ نیک عورت اس کی محبت کا دم بھرتی آئی تھی اور ہر دکھ سکھ میں اس کی شریک رہی تھی۔ وہ اس کے بچوں کی ماں تھی اور اس کی سلطنتِ دل کی ملکہ......

"مخدومہ، خدا نے مجھ پہ جو مہربانیاں کی ہیں، ان میں سب سے بڑی اس کی عنایت یہ ہے کہ اس نے تمہیں میری شریکِ زندگی بنایا...... اگر تم نہ ہوتیں تو شاید غیاث الدین کسی سردار کے گھوڑوں کا سائیس اور جنگل میں لکڑیاں چننے والا ایک عام سا انسان رہ جاتا۔"

"آپ کے مقدر میں تاجدارِ ہند بننا لکھا تھا۔" مخدومہ پورے یقین سے بولی۔ "بھلا اس منصب تک پہنچنے سے آپ کو کون روک سکتا تھا۔"

☆......☆......☆

بنگال روانہ ہونے کے لئے لشکر تیار تھا۔

سلطان نے ولی عہدِ سلطنت ملک جونا خان کو اپنا قائم مقام بنا کر رختِ سفر باندھا تھا۔ دمِ رخصت اس نے جونا خان کو سینے سے لگایا تھا مگر قرینِ قیاس یہی تھا کہ باپ سے گلے مل کر بھی جونا خان کا گلہ باقی رہا تھا۔

سلطان غیاث الدین منزلوں پہ منزلیں مارتا ناصر الدین کی مدد کی درخواست پر بنگال پہنچا اور حملہ آور ہوا۔

سلطان ایک دانا اور تجربہ کار جرنیل تھا۔ اس کے حکمتِ عملی سے کئے گئے پہلے ہی حملے نے جنگ کا فیصلہ کر دیا۔ ناصر الدین کا باغی بھائی بہادر شاہ راہِ فرار اختیار کرنے پہ مجبور ہو گیا تھا۔ سلطان کے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ ناصر الدین نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی۔ اُسے سلطان نے لکھنوتی کی حکومت مرحمت فرمائی۔ اس کے بعد ستار گاؤں اور ست گاؤں کے علاقے فتح کر کے سلطنتِ دہلی میں شامل کئے اور پھر واپسی کا رخ کیا۔

راستے میں ترہٹ کا قلعہ تھا، جو بے حد مضبوط تھا۔ سلطان قلعے پر حملہ آور ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی فتح اس کا مقدر بنی۔ قلعہ ترہٹ کا راجہ ہرسنگھ دیو نے شکست کے بعد مطیع و باج گزار بننا قبول کیا اور سلطان غیاث الدین اپنی فتوحات کی فہرست میں ایک اور شاندار فتح تحریر کرتا، کامیابی و کامرانی کے شادیانے بجاتا دہلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

تلنگانہ اور ورنگل کی مہم کے دوران پیغام رسانی کے مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث، جو فتنہ اٹھا تھا، اس کے تدارک کے لئے سلطان نے ایسا نظام قائم کیا تھا کہ لحظہ لحظہ کی خبر دہلی سے سلطان کے پاس اور سلطان کے پاس سے دہلی پہنچتی تھی۔

انہی ذرائع سے سلطان کے پاس یہ خبریں بھی پہنچ رہی تھیں کہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ اپنی روش پہ قائم تھے۔ وہاں پہلے کی طرح ہی محافلِ سماع کا انعقاد ہو رہا تھا۔ لوگ جوق در جوق ان محافل میں شریک ہوتے تھے۔

"اب جبکہ بنگال کا مسئلہ بخیر و خوبی حل ہو چکا ہے۔" ملک لکھی نے دھیمے لہجے میں بات کا آغاز کیا۔ "تو آپ کو...... اس قضیے کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" سلطان نے کسی قدر غصیلے لہجے میں کہا۔ "میرے درگزر اور نرم رویّے نے حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو گستاخ اور خودسر کر دیا ہے۔"

"وہی تو......" ملک لکھی لپکتے لہجے میں بولا۔ "آپ کو دہلی پہنچتے ہی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی اس بے نیازی اور خودسری کا تدارک کرنا چاہئے...... مگر مجھے امید نہیں کہ وہ اپنے مؤقف سے ذرہ بھر بھی ہٹیں گے۔"

"اگر وہ اپنے مؤقف پر ڈٹے رہیں گے تو انہیں دہلی چھوڑنا ہوگا۔" سلطان نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا۔ "ہم دارالسلطنت میں کسی بھی ایسے شخص کو برداشت نہیں کریں گے۔"

"سلطانِ معظم کا فیصلہ بالکل درست اور بہترین ہے۔" ملک لکھی نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "اگر انہیں دہلی بدر ہونے کا حکم دینا ہے، تو دہلی پہنچنے کا بھی کیوں انتظار کیا جائے...... یہ حکم تو آپ یہاں سے بھی صادر کر سکتے ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" سلطان نے حیرانی سے پوچھا۔

"مطلب یہ کہ آپ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو پیغام بھجوا دیجئے کہ جب آپ دہلی میں داخل ہوں تو وہ دہلی میں موجود نہ ہوں۔"

ملک لکھی نے سرہلا کر مشورہ دیا...... اور سلطان سوچ میں ڈوب گیا۔

وہ جانتا تھا اُس کی بیوی مخدومہ جہاں اور بیٹا جونا خان، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے بے حد عقیدت مند ہیں۔ اس کا یہ حکم اُن دونوں کے لئے باعثِ ملال ہوگا، اس لئے وہ اس حکم کو صادر کرنے سے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔

"میرا خیال ہے ملک لکھی کہ ہمیں دہلی پہنچنے کے بعد ہی اس مسئلے پر کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔"

"مگر سلطانِ معظم...... اس معاملے کو چلتے مہینوں گزر گئے...... ابھی دہلی پہنچنے میں ہمیں کئی ہفتے درکار ہیں...... گزرتے وقت کا ہر لمحہ ان کی سرکشی کو استحکام بخش رہا ہے...... میرا تو خیال ہے سلطانِ معظم کو فیصلہ کرنے میں اب گھڑی بھر کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہئے۔"

ملک لکھی اور اس جیسے چند اور امراء کے سمجھانے پر آخر سلطان، حضرت نظام الدین اولیاءؒ کو شہربدری کا حکم نامہ بھیجنے پر آمادہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

اس شام خود جونا خان بھی حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی محفلِ سماع میں شریک تھا، جب سلطان کے پیغام بر نے آ کر سلطان کا پیغام سنایا تھا۔

"آپ نے میری حکم عدولی کی ہے، اس لئے اب میں آپ کا وجود دلّی میں برداشت نہیں کروں گا...... جب میں دلّی پہنچوں، اس سے قبل ہی آپ دلّی سے چلے جایئے۔"

پیغام سن کر جونا خان کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ نے نگاہ اٹھا کر اس کے سپید پڑتے چہرے کی طرف دیکھا۔ پھر ہلکے تبسم اور پورے سکون کے ساتھ جواب دیا۔

"ہنوز دلّی دور است۔"

چند دنوں میں سلطان دلّی پہنچنے والا تھا۔ جونا خان نے فاتح باپ کے استقبال کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ دہلی سے چھ میل کے فاصلے پر سلطان کے تعمیر کردہ شہر تغلق آباد میں جونا خان نے سلطان کے استقبال کے لئے ایک چوبی محل بنوانے کا فیصلہ کیا تھا۔

تین چار دنوں کے شبانہ روز کام کے بعد تغلق آباد کے مقام پر یہ چوبی محل تعمیر ہو گیا۔ یہ محل عارضی تھا اور چوبی ستونوں کے سہارے کھڑا تھا۔ یہاں سلطان کو عارضی طور پر قیام کرنا تھا۔ ظہرانے کا اہتمام تھا اور پھر سرِ شام سلطان کو وہاں سے دلّی کے لئے روانہ ہو جانا تھا۔

جونا خان شب و روز اسی انتظام و انصرام میں مصروف تھا۔ مسلسل مصروفیت، تھکن بن کر اس کے وجود پر چھا گئی تھی۔ آنکھوں سے پریشانی جھلکتی اور چہرے سے فکر و تردّد کا اظہار ہوتا تھا۔

فیروز خان خاموش نظروں سے بھائی کی بدلتی کیفیتوں کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اُسے دنیا میں سب سے زیادہ اپنا بھائی عزیز تھا۔ جونا خان کی پیشانی کا ایک بل اس کی زندگی کے سکون و اطمینان کو تہہ و بالا کر دینے کے لئے کافی ہوتا تھا۔ جونا خان کی آنکھوں سے جھانکتی پریشانی کی ایک چھوٹی سی رمق بھی فیروز کی روح تک کو متوحش کر دینے کی طاقت رکھتی تھی۔

اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود فیروز خان، جونا خان کی پریشانی اور فکرمندی کا عقدہ حل نہ کر سکا تھا۔ کبھی کبھی اُسے خیال آتا کہ شاید اس کی تنہائی اور اکیلے پن نے اس کے اندر مایوسی اور محرومی کا احساس جگا دیا ہے، مگر یہ تنہا زندگی خود اس کی اختیار کردہ تھی جبکہ اس کی ماں مخدومہ جہاں نے تو اس کے لئے کتنے ہی رشتے دیکھ رکھے تھے۔

اور پھر وہ...... چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں والی لڑکی...... کہ جس کا نام اُسے بہت بعد میں معلوم ہوا تھا...... زرنگار بانو...... جس کا تخلص "تنہا" تھا اور وہ فارسی کی بہترین ریختہ گو شاعرہ تھی۔

اُس شام تلنگانہ کی مہم پہ روانگی کے وقت زرنگار کی خادمہ خجستہ بی بی امام ضامن لے کر حاضر ہوئی تھی...... اس بات کو برسوں بیت گئے تھے۔ اس کے بعد کوئی پیام و سلام نہیں آیا تھا، نہ کوئی خیر خبر ہی ملی تھی۔

کیا اب تک زرنگار بانو...... جونا خان کی راہ دیکھ رہی ہوگی؟

یا جونا خان کے مسلسل تغافل سے تنگ آ کر اور تنہا زندگی کے ہاتھوں عاجز ہو کر اُس نے اپنے گھر اور دل کا دروازہ کسی اور کے لئے کھول دیا ہوگا......؟

فیروز خان کو زرنگار کی دیوانہ وار محبت سے اس قسم کی کج ادائی اور بے وفائی کی توقع نہیں تھی...... مگر سوال یہ تھا کہ آخر وہ کس توقع پر جونا خان کا انتظار کرتی رہی۔ جونا خان نے تو کبھی بھولے سے بھی اُس کا ذکر نہ کیا تھا، نہ کبھی پلٹ کر اس کی خبر لی تھی۔

جانے وہ کس حال میں ہوگی......؟ اس خیال نے فیروز خان کو وحشت زدہ کر دیا تھا۔ بالکل اچانک ہی اس کے دل میں خیال جاگا تھا کہ اُسے زرنگار کی خبر لینی چاہئے۔ فیروز خان، جونا خان کو بے حد و حساب چاہتا تھا اور اس کی چاہت کا تقاضا تھا کہ وہ جونا خان کے چاہنے والوں کو بھی چاہے۔ سو، اسی شام وہ شاہی محلے میں واقع نصرت خان کی حویلی کی طرف روانہ ہو گیا۔

شام کے پھیلتے سرمئی سایوں میں سال خوردہ اور خستہ حال حویلی خاموش اور اُداس کھڑی تھی۔ حویلی کے خاک اُڑاتے احاطے اور بیرونی دالانوں میں گونجتے سناٹے کسی بھی ذی نفس کے وہاں موجود نہ ہونے کے غماز تھے۔

کیا زرنگار بانو...... یہاں سے کہیں اور منتقل ہو گئیں؟ اس خیال نے فیروز خان کو ہراساں کر دیا تھا...... وہ گھوڑا دوڑاتا لکڑی کے بدرنگ پھاٹک کے قریب آ ٹھہرا تھا۔ ٹاپوں کی آواز سن کر بوڑھا دربان اپنی کوٹھری سے نکل کر پھاٹک تک پہنچا...... اور فیروز خان کو دیکھ کر حیران ہوا۔

"آپ......؟" بوڑھے دربان نے آنکھیں میچ کر اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"میرا نام فیروز خان ہے۔ میں......" فیروز خان سٹپٹا کر خاموش ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنے یہاں آنے کا کیا مقصد بیان کرے۔

"آپ سلطان کے مرحوم بھائی رجب خان کے صاحبزادے ہیں نا؟" دربان نے تصدیق چاہی اور فیروز کے اثبات میں سرہلانے پر بدرنگ، سال خوردہ پھاٹک وا کر دیا۔

فیروز خان کا گھوڑا پھاٹک سے داخل ہو کر دُلکی چال چلتا چند تنگی سیڑھیوں کے اوپر ایستادہ مرمر کے گول قطر والے نچی ستونوں سے گھرے اسی بیرونی دالان کے پاس آ ٹھہرا تھا، جہاں برسوں پہلے زرنگار نے اپنی بے پناہ اور بے لوث محبت کا اظہار کیا تھا۔

نصرت خان کے انتقال کے بعد اب گھر میں کوئی مرد موجود نہ تھا، اس لئے گھوڑے تھے، نہ سائیس...... چنانچہ بوڑھے دربان نے آگے بڑھ کر فیروز خان کے گھوڑے کی لگام تھام لی اور فیروز خان رکاب میں پاؤں دھرے بغیر اچھل کر نیچے آ گیا۔

تب ہی دروازہ کھول کر بوڑھی اَنّا خجستہ بی بی دالان میں داخل ہوئی اور دالان کی سیڑھیوں کے قریب حیران و پریشان فیروز خان کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ وہ فیروز خان کو ہمیشہ ہی جونا خان کے ہمراہ دیکھتی رہی تھی۔ گو کہ اب وہ پہلے والا دس گیارہ برس کا بچہ نہ رہا تھا بلکہ اٹھارہ سال کا خوبرو اور کڑیل جوان بن چکا تھا مگر خجستہ بی بی نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا۔

"سرکار، آپ......؟" وہ تیزی سے سیڑھیاں اُترتی اس کی جانب لپکی تھی۔ "آپ نے مجھے پہچانا...... میں خجستہ حرماں نصیب...... ننھی بیگم کی نگوڑی اَنّا ہوں۔" اس نے جلدی جلدی اپنا تعارف کروایا۔ پھر بولی۔ "آپ فیروز خان ہیں نا...... جونا خان کے چچیرے بھائی؟"

"ہاں۔" فیروز خان نے پیشانی پر پھوٹ آنے والے پسینے کو رومال سے صاف کرتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔ "بس اس طرف سے گزر رہا تھا...... سوچا......"

اب وہ جذباتی ہو کر اس طرف آ نکلنے پر کچھ جزبز اور شرمندہ ہو رہا تھا۔ ایک ایسے گھر میں جہاں کوئی مرد نہ ہو، کسی نوجوان کی آمد کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟ اس سوال نے اسے پریشان کر دیا تھا۔

"بہت اچھا کیا جو آپ چلے آئے...... اگر اپنے ساتھ آپ انہیں بھی لے آتے تو......"

"انہیں تو علم ہی نہیں کہ میں یہاں آیا ہوں۔" فیروز خان نے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اعترافِ جرم کیا۔ "اگر میں ان سے کہتا تو شاید وہ مجھے یہاں آنے کی کبھی اجازت نہ دیتے۔"

"ہاں، سو تو ہے۔" خجستہ بی بی نے بے بس انداز میں گہرا سانس لیا۔ "چلئے یہی کیا کم ہے کہ آپ تشریف لے آئے۔" لحظہ بھر کو بوڑھی اَنّا کے پپڑی زدہ لبوں پہ مسرور تبسم جاگا، پر اگلے ہی لمحے وہ رنجور و ملول لہجے میں بولی۔ "آج کل ننھی بیگم سخت علیل ہیں۔"

"کیا ہوا انہیں؟" فیروز خان نے بے تابانہ سوال کیا۔

"خدا معلوم کیا ہوا ہے، کھانا پینا چھٹ گیا ہے، سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہیں، نقاہت کے باعث چلنا پھرنا موقوف ہو گیا ہے، رات دن بستر پر پڑی منتظر نگاہوں سے دروازے کی طرف تکا کرتی ہیں۔"

"اوہ...... آپ نے کسی طبیب کو بلوایا؟" فیروز خان نے اس کی کیفیت سن کر متوحش لہجے میں سوال کیا۔

"وہ کسی کو بلوانے پر آمادہ ہی نہیں ہوتیں۔" بوڑھی خادمہ نے سر جھکا کر بے بسی سے کہا۔ "کہتی ہیں...... اب موت ہی میرا علاج ہے۔"

فیروز خان خواہش کے باوجود زرنگار سے ملاقات کی ہمت نہ کر سکا۔ وہ چشمِ تصور سے اس کی برباد حالت دیکھ سکتا تھا، سو ملال و رنج سے سرہلاتا واپسی کے لئے پلٹ گیا۔

جب وہ واپس قصر میں پہنچا تو اس نے دیکھا جونا خان، ولی نعمت خان اور اسی جیسے چند شاطر و عیار فطرت مصاحبین میں گھرا کسی اہم مسئلے پر بحث میں مصروف ہے۔ فیروز خان اس ایوان میں داخل ہوئے بغیر غلام گردش میں چلتا خواب گاہ کی جانب بڑھ گیا۔

کیا جذبے اتنے بے وقعت اور نارسا بھی ہوتے ہیں؟

کیا محبت اتنی کمزور اور بے مایہ بھی ہو سکتی ہے...... کہ لبِ گور پہنچ کر بھی خود کو منوا نہ سکے؟

یہ محبت کی کمزوری تھی یا محبوب کی ہٹ دھرمی...... فیروز خان فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

جونا خان تخت و تاج کی چکاچوند میں شاید اس تاریک ڈیوڑھی میں بسترِ مرگ پر پڑی اس حرماں نصیب لڑکی کو بالکل فراموش کر چکا تھا جس نے اپنے تئیں اسے اپنا سب کچھ مان کر تا حیات اسی کے نام پر بیٹھے رہنے کا تہیہ کیا تھا، مگر ختم نہ ہونے والے انتظار کا یہ کرب اس کا ننھا سا دل سہہ نہ سکا اور موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا اس کے آخری دیدار کا منتظر تھا۔

کیا محبت کی یہ شمع بجھ جائے گی؟

کیا چاہت کی لے پر مچلتے دل کی دھڑکنیں تھم جائیں گی؟

کیا زرنگار بانو تنہا...... تنہائی کا کرب سہتے سہتے بالآخر ہار جائے گی؟

اور محبت کے دامن کو تھامنے کی امید میں موت کو گلے لگا لے گی؟

"نہیں...... ایسا نہیں ہونا چاہئے۔" فیروز خان نے تڑپ کر سوچا تھا اور اگلے ہی دن شاہی حکیم احسن علی خان کو زرنگار کے علاج و معالجے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

☆......☆......☆

اوائل مارچ کا سورج تغلق آباد کے نیلے آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ سردیوں کے موسم کی رخصت ہوتی مدھم سی خنکی کا اثر اب بھی باقی تھا، جس کے باعث دھوپ کی تمازت ایک تسکین بھری حرارت بخشتی، بھلی معلوم ہو رہی تھی۔

سلطان اپنے فاتح لشکرِ جرار کے ساتھ تغلق آباد میں داخل ہو چکا تھا۔ شہر کے وسط میں واقع چوبی محل کے سامنے ولی عہد جونا خان اپنے تمام امراء و وزراء کے ساتھ اپنے تاجدار والدِ گرامی کا منتظر تھا۔

سب سے آگے ہاتھی پر ساگوان کی لکڑی اور سونے چاندی کے امتزاج سے بنے ہودے میں سلطان جلوہ افروز تھا، اس کے دائیں بائیں اس کے چھ جری و شجاع جرنیل رواں دواں تھے۔

سلطان کے ہاتھی کے رکتے ہی امراء و وزراء اور ولی عہد جونا خان آگے بڑھے۔ جونا خان کے ساتھ فیروز خان اور اس کا سب سے چھوٹا بھائی محمود خان بھی تھا۔ تیرہ سالہ محمود خان سلطان کا بے حد لاڈلا اور چہیتا بیٹا تھا۔ وہ باپ سے بے حد مانوس تھا۔ اس کے لام پہ جانے کے بعد محمود خان سخت اُداس اور رنجیدہ تھا اور آج جونا خان سے ضد کر کے وہ باپ کے استقبال کے لئے آیا تھا۔

سلطان نے سب سے پہلے جونا خان کو سینے سے لگایا۔ اپنے ولی عہد اور لختِ جگر کو سینے سے لگا کر اسے دلی سکون کا احساس ہوا۔ وہ اپنے بھتیجے فیروز خان کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے معانقے کے بعد اس کی نگاہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے محمود خان پر پڑی تو اس کی آنکھوں میں مسرت بھری چمک جاگ اٹھی۔

غیاث الدین تغلق ایک اچھا باپ تھا۔ وہ اپنے سب ہی بچوں سے والہانہ محبت کرتا تھا مگر جونا خان کو سب سے بڑے اور محمود خان کو سب سے چھوٹے ہونے کے ناتے خصوصی طور پر چاہتا تھا چنانچہ اس وقت محمود خان کو اپنے سامنے پا کر وہ بے حد مسرور ہوا اور اس نے اُسے اپنی بانہوں میں بھر کر بے ساختہ اس کی پیشانی کا بوسہ لے لیا تھا۔

پھر امراء و وزراء نے باری باری آگے بڑھ کر سلام اور کامیابی کی مبارکباد پیش کی۔ نذریں گزارنے اور ہاتھی، گھوڑے پیش کرنے کا پروگرام دوپہر کے کھانے کے بعد رکھا گیا تھا۔ سلطان ہاتھی سے اتر کر لکڑی کے اس خوش نما قصر میں داخل ہوا جو جونا خان نے اس کے استقبال کے لئے تعمیر کروایا تھا۔ نشست گاہ کے علاوہ سلطان کے آرام کے لئے خواب گاہ اور طعام گاہ کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ سفر کی تھکان اُتارنے کے خیال سے غسل کے بعد سلطان نشست گاہ میں آ گیا۔

شاہی مطبخ خانے میں سلطان اور مہمانوں کے ظہرانے کے لئے مشاق اور ماہر باورچی کھانے تیار کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

لشکریوں کے لئے بھی دعوتِ عام کا اہتمام تھا۔ قصر کے احاطے میں دور دور تک خانسامے اور باہمن رسوئیے چھولداریاں لگائے بیٹھے تھے۔ اینٹوں کے عارضی چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ہندو لشکریوں کے لئے بڑی بڑی کڑاہیوں میں اصلی گھی میں پوریاں تلی جا رہی تھیں، سوجی کا حلوہ گھوٹا جا رہا تھا۔ ایک جانب آلو اور چھولوں کی ترکاری تیار ہو رہی تھی۔ گویا عید کے میلے کا سا سماں تھا۔ کھانا تیار ہو چکنے کے بعد طعام خانے میں لگا دیا گیا۔ ایرانی مخملیں غالیچوں اور حریری پردوں سے آراستہ کھانے کا یہ ایوان خصوصی طور پر سجایا گیا تھا۔ دیواروں کے ساتھ جا بجا ساگوان کی چھوٹے پایوں والی منقش تپائیوں پر چاندی کے پیالوں میں تازہ پھول سجے تھے، جن کی جاں فزا خوشبو فضا میں ایک تازگی کا احساس جگا رہی تھی۔ خصوصی زردوزی کی کام والی مخملی وردیوں میں ملبوس خدام چاندی کے آفتابے اور سلفچیاں تھامے مہمانوں کے ہاتھ دھلانے میں پیش پیش تھے۔

ظہر کی نماز کی ادائیگی کے بعد سلطان اپنے جرنیلوں، ولی عہد، بھتیجے اور چھوٹے شاہزادے محمود خان کے ساتھ طعام خانے میں داخل ہوا۔ امراء و وزراء کے کھانے کا بھی یہیں انتظام تھا۔ خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ سلطان نے اپنے لائق بیٹے کی انتظامی قابلیت اور اس قصر کی تعمیر کر کے استقبال کے انوکھے خیال کی تعریف کی...... کھانا بھی سب ہی کو بے حد پسند آیا تھا۔

کھانے کے بعد ولی عہد جونا خان، فیروز خان کو ہمراہ لے کر تمام وزراء و امراء کے ساتھ نذریں اور ہاتھی، گھوڑوں کے پیش کرنے کے انتظامات میں لگ گیا جبکہ سلطان چھوٹے شاہزادے محمود خان اور اپنے جرنیلوں کے ساتھ قیلولے کی غرض سے ایک کشادہ خواب گاہ میں آرام دہ ریشمی بستر پر جا لیٹا۔

کوئی چار بجے کا عمل ہوگا...... کہ ایک زوردار گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ایک طوفان سا اُٹھا تھا اور سیکڑوں ستونوں پر کھڑا وہ عارضی چوبی محل بالکل اچانک ہی زمین بوس ہو گیا تھا۔

قیلولے کی غرض سے لیٹنے والا سلطان دہلی غیاث الدین تغلق خواب گاہ کے موٹے شہتیروں سے مزین چھت تلے دب کر اپنے قابلِ اعتماد جرنیلوں اور سب سے چھوٹے اور چہیتے بیٹے محمود خان سمیت ہمیشہ ہمیشہ کی نیند سو گیا تھا۔

(جاری ہے)

سلطان محمد تغلق

اشتیاق وارثی

قسط 9

ابن الوقت قسم کے لوگوں کے بہکاوے میں آکر غیاث الدین تغلق نے خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کو خط بھیجا تھا کہ "میرے شہر میں داخل ہونے سے قبل آپ دلّی چھوڑ کر چلے جائیں۔"

اُس فقیر منش انسان کو شہر بدری کا حکم دینے والے سلطان کو خود شہر میں داخل ہونے کی مہلت نہ ملی اور وہ دلّی میں داخل ہونے سے قبل ہی دہرسے رخصت ہو گیا تھا۔

جب زمین بوس چھت کا ملبہ اُٹھایا گیا تو سلطان کو اپنے نوعمر بیٹے محمود خان پر اس طرح جھکا ہوا پایا گیا جیسے موت کے بے رحم پنجے سے وہ اپنے لختِ جگر کو بچا لینا چاہتا ہو مگر موت کی ظالم گرفت سے کوئی بھی نہ بچ سکا تھا، نہ معصوم اور نوعمر محمود خان، نہ اس کے جری و شجاع پانچوں جرنیل اور نہ ہی سلطانِ ہند غیاث الدین تغلق......!

تغلق کی حادثاتی موت کی خبر دلّی پہنچی تو پورے شہر اور قصر شاہی میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ مخدومہ جہاں نے چوڑیاں توڑ کر سر پر خاک ڈال لی۔ اُس پر تو بیک وقت دو قیامتیں ٹوٹی تھیں، ایک طرف شوہر بچھڑ گیا تھا تو دوسری طرف چہیتا لختِ جگر چھن گیا تھا۔

غیاث الدین تغلق ایک اچھا حکمران تھا۔ اپنے چار سالہ دورِ حکومت میں سلطان نے دلّی والوں کے دلوں میں خوب گھر کر لیا تھا، تب ہی تو ہر گھر سے آہ و گریہ کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہر دل رنجور تھا، ہر لب پر آہ و فغاں تھی اور ہر آنکھ اشکبار تھی۔

کیسا حادثہ تھا جو لمحہ بھر میں، گردابِ بلاخیز کی طرح شہر کی رونقیں اور اہلِ شہر کی مسکراہٹیں بہا کر لے گیا تھا۔

کچھ مورخین کے نزدیک یہ حادثہ نہیں بلکہ جونا خان اور اس کے بدخواہ ساتھیوں کی سازش تھی۔ ان کے مطابق جونا خان صبر نہ کر سکا اور تخت حاصل کرنے کی عجلت میں اس سازش کا مرتکب ہوا لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ اس عارضی قیام گاہ کا انہدام اور سلطان اور اس کے قریبی ساتھیوں کی اموات اتفاقیہ تھیں۔ اس حادثے میں جونا خان کا کوئی ہاتھ نہ تھا۔ مورخ برنی کے مطابق آسمانی بجلی گرنے سے محل زمین بوس ہو گیا تھا۔

جونا خان اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا اور لیاقت و اہلیت میں سب سے آگے تھا۔ سلطان غیاث الدین اُسے بے حد چاہتا تھا۔ اس نے اسے ولی عہد نامزد کیا تھا۔ وہ اسے دیگر بھائیوں سے ممتاز و برتر تصور کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اسے دو بار فوج کے ساتھ دکن بھیجا اور جب خود بنگال کی مہم پر گیا تو اسے دہلی میں اپنا نائب مقرر کر گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہی تخت و تاج کا وارث تھا۔ اس کو علاؤ الدین خلجی یا بعد کے مغل شاہزادوں کی طرح کسی مخالفت یا دعویداروں کا خدشہ نہیں تھا۔ اس کا بوڑھا باپ 72 رویں برس میں تھا، بھلا وہ اور کتنا جی لیتا۔ اُسے لب گور ضعیف باپ کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، سلطنت تو اسے مل ہی جاتی، اسے سازش کرنے کی چنداں حاجت نہ تھی، لہٰذا جونا خان کو کسی ایسی سازش کا مرتکب قرار نہیں دیا جا سکتا جو تغلق کی موت کا سبب ہو۔

اب حقیقت جو بھی ہو، بہرحال ایک المیہ جنم لے چکا تھا۔ چوبی قیام گاہ کے زمین بوس ہونے کا حادثہ وقوع پذیر ہو چکا تھا اور سلطان غیاث الدین اور اس کے ساتھیوں کی المناک موت کا سانحہ پیش آچکا تھا۔

یہ حادثہ اندوہناک تھا مگر کاروانِ حیات پھر بھی رواں دواں تھا۔ کسی کے چلے جانے یا بچھڑ جانے سے سفر تو نہیں رکتا؟ کارواں یوں ہی رواں دواں رہتے ہیں، بس میر کارواں بدل جاتے ہیں۔ سو اس کارواں کے لئے بھی نئے میر کارواں کی ضرورت تھی۔ سلطنت کے لئے نئے سلطان کا انتخاب ناگزیر تھا۔ نامزد ولی عہد موجود تھا، بس اب تاج پوشی اور تخت نشینی کی رسم باقی تھی۔

سو غیاث الدین تغلق کے سوئم کے بعد تمام امراء، وزرا اور رعایا کی بھرپور تائید اور حمایت کے ساتھ جونا خان "فخر الدین جونا خان محمد بن تغلق" کے لقب سے 1325ء میں نہایت تزک و احتشام اور جاہ و جلال کے ساتھ تختِ دہلی پر متمکن ہوا۔

اس کی تاج پوشی پر امراء و عوام میں خوشی و انبساط کا اظہار کیا گیا۔ شہر میں عید کا سا سماں تھا، خوشی کے نقارے بجوائے گئے۔ آئینہ بندی ہوئی، سلطان نے ایک سفید ہاتھی پر طلائی و نقرئی ہودے میں بیٹھ کر شہر کا گشت کیا۔ سونے چاندی کے سکے، سچے موتی، قرص زر اور جواہرات ہاتھیوں پر لاد کر سلطان کی سواری کے آگے پیچھے کوچہ و بازار سے گزرتے تھے اور جو سامنے پڑتا، اس کی جھولی بھر دی جاتی۔ سیکڑوں فقراء اس روز کے بعد گدا سے غنی ہوئے اور بقیہ عمر بہ فراغت بسر کی۔

شہر کے گشت کے بعد شام کو اس نے دربار لگایا۔ دربار کی از سرِ نو تزئین و آرائش کی گئی۔ قندیلوں، فانوسوں اور مشعلوں کی چکا چوند نے شب میں بھی دن کا سماں پیدا کر دیا تھا۔

چوبی چبوترے پر بچھے مخملیں قالین پر دھرے تختِ شاہی پر جلوہ افروز سلطان محمد بن تغلق نے امراء، عمائدینِ شہر کو انعام و اکرام سے نوازنے کا سلسلہ شروع کیا اور وفاداروں میں عہدے و القابات تقسیم کئے۔

تاتار خان جو غیاث الدین تغلق کا قرابت دار تھا، اُسے "بہرام خان" کا خطاب دے کر تین سو ہاتھی، ہزار گھوڑے اور دو لاکھ اشرفیاں مرحمت فرمائیں اور بنگال و سنار گاؤں کی ولایت عطا کی۔ ملک سنجر بدخشانی کو اسّی لاکھ تنکے، ملک عماد الدین کو ستر لاکھ تنکے، مولانا ناصر الدین کافی کو چالیس لاکھ تنکے عطا کیے۔

ملک فیروز خان کو باربک کے نائب کا عہدہ بخشا اور ملک بیدار بخشی کو "قدر خان" کا خطاب دے کر لکھنوتی کی جاگیر عطا کی۔ قتلغ خان کو، جس سے اس نے قرآن شریف اور بعض فارسی اور عربی کتب پڑھی تھیں، "وکالۃ الدار ازرانی" کا خطاب دیا اور تیس لاکھ تنکے عطا کئے۔ ملک مقبول کو "عماد الدولہ" کے خطاب سے سرفراز کر کے وزیر کے عہدے پر فائز کیا۔ احمد ایاز کو "خواجہ جہاں" کا خطاب دے کر گجرات کا صوبیدار مقرر کیا۔ ملک کوچ خان کو "خان خاناں" کا خطاب دے کر وزیر کا قلمدان سونپا۔ ملک شہاب الدین کو "افتخار الملک" کا خطاب دے کر نوساری کی جاگیر عطا کی۔

اور اس طرح انعام و اکرام، خطابات اور عہدے عطا کر کے اس نے عوام و خواص کا دل موہ لیا۔ سب ہی نئے سلطان کے گرویدہ ہو گئے تھے۔

اُدھر سلطان محمد تغلق سرشاری و سرخوشی کے عالم میں تختِ دہلی پر جلوہ افروز ہو کر خواص و عوام کے تسخیرِ قلوب میں مشغول تھا......تو دوسری طرف ایک سالخوردہ اور بوسیدہ حویلی کی نیم تاریک خوابگاہ میں بسترِ علالت پر پڑی زرنگار بانو محرومی، ناکامی اور مایوسی کے عالم میں زندگی کی آخری سانسیں گن رہی تھی۔

جس دم سلطان محمد بن تغلق کا جلوس گزر رہا تھا، اس نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں۔ "یہ شور کیسا ہے اناّ بی؟"

"سلطان محمد تغلق تاج پوشی کے بعد شہر کے گشت پر نکلے ہیں، اسی کا شور ہے۔" خجستہ بی بی کی بجائے سراج نے جواب دیا تھا۔

"اناّ بی! مجھے سہارا دے کر دو چھتی کے جھروکے میں بٹھا دو۔ میں ان کا جلوس دیکھنا چاہتی ہوں۔" زرنگار نے تڑپتے لہجے میں التجا کی تھی۔

خجستہ بی بی نے سہارا دے کر اُسے جھروکے میں بٹھا دیا تھا۔ سفید ہاتھی پر زریں و سیمیں ہودے میں، سرخ چھترِ شاہی تلے، فاخرانہ لباس میں ملبوس، سر پر سلطنتِ دہلی کا جگمگاتا ہوا تاج دھرے، آج کا سلطانِ ہند محمد تغلق اس شام کے جونا خان سے کس قدر الگ اور مختلف لگ رہا تھا، جس شام اس نے پہلی بار اُسے دیکھا تھا اور پہلی ہی نگاہ میں نگاہوں کی راہ سے وہ اس کے دل میں اتر گیا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی چاہت اور دیوانگی میں اضافہ ہوتا گیا لیکن اس کا یہ جنون بے اثر ثابت ہوا تھا۔ جونا خان سب کچھ جان کر بھی انجان بن گیا تھا کیونکہ اس کی منزل کسی بے مایہ عورت کا دل نہیں بلکہ سلطنتِ دہلی کا تخت و تاج تھا۔

سو آج اس نے اپنی منزل پالی تھی۔

وہ جونا خان سے سلطان محمد تغلق بن گیا تھا۔

جونا خان پہلے ہی کون سا زرنگار پر مہربان تھا، پر اب اس کے سلطان بن جانے کے بعد فاصلہ مزید بڑھ گیا تھا، کبھی نہ پُر ہونے والی خلیج درمیان میں آگئی تھی۔ مایوسی اور ناکامی کے اس احساس نے زرنگار کی روح تک کو کچل کر رکھ دیا تھا۔ جلوس کے گزر جانے کے بعد خجستہ بی بی نے اُسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا مگر اب اس کے تنِ ناتواں میں ایک اضطراب کی سی کیفیت جاگ اٹھی تھی۔ دھڑکنوں میں انتشار بپا تھا اور پورے وجود پر ایک لرزہ سا طاری تھا۔

"ننھی بیگم، تم ٹھیک تو ہو؟" اس کے سینے کے بڑھتے ہوئے زیر و بم کو دیکھ کر خجستہ بی بی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا اور متوحش انداز میں اس کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"اناّ بی......" زرنگار نے بند ہوتی آنکھوں کو ذرا سا کھول کر خجستہ بی بی کی طرف دیکھا۔ "تم نے محسوس کیا کہ ان رکتی تھمتی دھڑکنوں میں انہی کا نام ہے۔"

"ننھی بیگم۔" زرنگار کے ڈوبتے لہجے نے خجستہ بی بی کو بدحواس کر دیا۔

"اناّ بی"......زرنگار نے اپنے سرد ہاتھ میں خجستہ بی بی کا ہاتھ جکڑتے ہوئے کہا۔ "تم گواہ رہنا، دمِ آخر میری زبان پہ انہی کا نام ہے......ان آنکھوں نے آخری لمحے تک صرف انہی کی راہ تکی...... نصیب تو دیکھو......وہ آج اس کوچے سے گزرے لیکن اس دروازے پر رکے بنا آگے بڑھ گئے......اب ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں......سو یہ منتظر آنکھیں اب بند ہوئی جاتی ہیں...... پر تم گواہ رہنا کہ رکتے دم تک اس دل میں وہی بسے رہے اور دمِ آخر انہی کا نام لبوں پر رہا۔"

"ننھی بیگم......کیسی باتیں کر رہی ہو؟ تم ٹھیک ہو جاؤ گی بٹیا۔" خجستہ بی بی نے مضطرب لہجے میں کہا اور دروازے کی طرف رخ کر کے سراج کو صدا دی۔ "ارے او سراج......کہاں غائب ہے......ذرا دوڑ کر بڑے حکیم صاحب کو تو بلا لا...... ننھی بیگم کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔"

"اب یہ طبیعت......کسی حکیم......کے آنے سے نہ سنبھلے گی۔" زرنگار نے نقاہت بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر اس پل وہ خود آ جائیں تب بھی یہ گھڑی نہیں ٹلنے والی۔"

"ننھی بیگم، تم کہو تو میں ملک فیروز کے پاس جاؤں، وہ انہیں ضرور یہاں لے آئیں گے۔"

"بہت بھولی ہو تم اناّ بی۔" زرنگار کے پپڑی زدہ لبوں پر کرب بھرے مبہم تبسم کی لو ٹمٹمائی۔ "وہ ان چھوٹی باتوں سے بہت بلند ہیں......ان کی ترجیحات کچھ اور ہیں......تم نے دیکھا تھا......سفید ہاتھی کے سنہری ہودے میں، سر پر تاجِ زریں دھرے وہ کتنے بلند......کتنے عظیم لگ رہے تھے......یہ ایک ذرا سی محبت......ان کی نگاہوں میں کیا وقعت رکھتی ہے بھلا......"

مسلسل بولتے رہنے کے باعث اب اس پر نقاہت طاری ہونے لگی تھی۔ پورا وجود پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ سراج کمرے میں داخل ہوا اور اس کی دگرگوں حالت دیکھتے ہی اُلٹے قدموں حکیم کو بلانے دوڑا۔

مگر حکیم احسن علی خان کی آمد سے قبل ہی زرنگار بانو اپنی نامراد اور حسرتناک محبت کا ماتم کرتی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

اُس سہ پہر اپنی ماں کد بانو سے مل کر ملک فیروز جونہی ڈیوڑھی میں داخل ہوا، ایک خادم نے اطلاع دی۔ "ملک نصرت خان کی خادمہ خجستہ بی بی آپ سے ملاقات کی منتظر ہے۔"

"اوہ......" فیروز خان کے لب پُرتشویش انداز میں سمٹ گئے۔ "بلاؤ فوراً۔"......اور اگلے ہی لمحے افسردہ چہرے، بجھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ خجستہ بی بی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔

"لونڈی سلام عرض کرتی ہے۔"

"خیریت تو ہے اناّ بی......؟" فیروز خان نے اس کے رنجیدہ چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"جی سرکار!" خجستہ بی بی نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "مرحوم سلطان غیاث الدین نے بنت نصرت خان کی رہائش کے لئے حویلی اور گزر اوقات کے لئے وظیفہ مقرر کیا تھا لیکن کیونکہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہیں، اس لئے میں آپ سے گزارش کرنے آئی ہوں کہ اب وہ دونوں چیزیں واپس لے لی جائیں۔"

"کیا......؟" فیروز خان کو ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ "بنت نصرت خان......؟"

"جی، زرنگار بانو بنت نصرت خان کا انتقال ہو چکا ہے۔" بوڑھی خجستہ بی بی کی آواز آنسوؤں کے ریلے میں بہہ گئی تھی۔

فیروز خان کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔

وہ زندگی سے بھرپور مدھر آواز، وہ خمار میں ڈوبی آنکھیں، وہ دلکش مہتابی چہرہ، وہ دلنشین دلربا سراپا، وہ سب ختم ہو گیا؟ مٹ گیا......؟

"مگر یہ سب کیسے ہو گیا......ہم نے تو بڑے حکیم صاحب کو......"

"مرضِ محبت کی دوا بھلا کسی وید حکیم کے پاس کہاں؟" خجستہ بی بی نے آنچل میں آنسوؤں کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ "مگر جس کی خاطر تڑپتے ہوئے انہوں نے جان دی، وہ سنگدل ان کی بے لوث اور سچی محبت کی قدر نہ کر سکا......شاید تخت نشینوں کے سینے میں دل کی جگہ پتھر ہوتے ہیں......میری کوئی بات ناگوار گزری ہو تو معافی چاہتی ہوں۔"

خجستہ بی بی اپنی بات مکمل کر کے جا چکی تھی مگر فیروز خان کئی لمحوں تک اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا تھا۔ زرنگار کی موت کا اُسے گہرا صدمہ ہوا تھا۔

پھر کوئی خادمہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی۔ آہٹ پر فیروز خان چونک کر سیدھا ہوا اور سر جھکائے شکستہ قدموں سے سلطان کے ایوانِ خاص کی طرف روانہ ہو گیا۔

سلطان محمد تغلق اس وقت اپنے وزراء و امراء کے درمیان گھرا بیٹھا تھا۔ فیروز خان نے چند لمحے دروازے پر رک کر اس کی توجہ کا انتظار کیا مگر شاید اسے فیروز کی آمد کا پتہ ہی نہ چلا، چنانچہ وہ آہستگی سے چلتا اندرونی کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ایک لمحے کو اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اُسے یہ خبر سنائے مگر پھر اُسے خیال آیا کہ وہ زرنگار کا نام اپنے ہونٹوں پر نہ لانے کا وعدہ کر چکا ہے......ویسے بھی اُسے یقین تھا کہ یہ المناک خبر سن کر اس کے سپاٹ اور جذبات سے عاری چہرے پر ملال کی ایک شکن تک نہ اُبھرے گی۔ سو اس نے سلطان کو یہ خبر دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور خاموشی سے اندر چلا گیا۔

آج کل سلطان محمد تغلق ایک بڑی مصیبت کا شکار تھا اور رات دن اپنے امراء و وزراء اور مشیروں کے ساتھ صلاح مشورے میں مصروف تھا۔

منگولوں نے اپنے سردار ترمہ شیریں خان کی سرکردگی میں ہندوستان پر حملہ کر دیا تھا۔ پنجاب کو تباہ کرنے کے بعد اب وہ دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر قبل اطلاع آئی تھی کہ ترمہ شیریں خان نے دہلی سے باہر سرسوتی کے میدان میں اپنا لشکر اُتار دیا ہے۔

شام کے سرمئی سائے رات کی سیاہیوں میں گھلتے جا رہے تھے۔ سلطان محمد تغلق دریچے میں کھڑا، گہری ہوتی تاریکی کو گھور رہا تھا۔ اس کے اندر بھی گھور اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس سے چند قدموں کے فاصلے پر ملک اسماعیل، خواجہ جہاں، ملک کوچک اور الغ خان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ تمام لوگوں کے چہروں سے تشویش ہویدا تھی۔

وہ سب ترمہ شیریں کے متوقع حملے کی روک تھام اور مقابلے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے سلطان کے پاس جمع ہوئے تھے۔ منگولوں کے ہاتھوں پنجاب کی تباہی سے لے کر بیرونِ دہلی ان کے لشکر کے پڑاؤ کی تمام داستان سن کر سلطان بنا ایک لفظ بولے دریچے میں جا کھڑا ہوا تھا۔

کافی دیر تک وہ سب اس کے تبصرے کے منتظر رہے تھے مگر اس کی طرف سے جب خاموشی کا وقفہ بڑھا تو ملک اسماعیل نے خود ہی سوال کیا۔

"اس طوفانِ بلاخیز کو روکنے اور اس کے سامنے بند باندھنے کے حوالے سے آپ نے کیا سوچا ہے؟"

"میں نے اس خطرے کا مقابلہ کرنے کا ایک نیا طریقہ سوچا ہے۔" سلطان نے قدرے توقف کے بعد جواب دیا۔ "اور وہ یہ کہ میں ترمہ شیریں خان کی خدمت میں زر و جواہر پیش کر کے اسے واپس جانے کے لئے آمادہ کروں۔"

"کیا......؟" تینوں بوڑھے وزیر ہکا بکا رہ گئے تھے۔ ملک اسماعیل کو تو اس کی ذہنی صحت پر شبہ سا ہوا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ اُس ظالم ترمہ شیریں خان کو کہ جس نے ہندوستان کے ایک زرخیز و شاداب صوبے کو لوٹ کر ویرانے میں بدل دیا ہے......آپ اس کی خدمت میں بیش قیمت تحائف اور زر و جواہر پیش کریں گے؟"

"اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے......یہی ایک محفوظ راستہ ہے۔" سلطان محمد تغلق نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ "اس وقت ہمارا لشکر اس قابل نہیں ہے کہ اُس کی وحشی فوج کا مقابلہ کر سکے......دہلی کو تباہی سے بچانے کا اب صرف یہی ایک راستہ ہے......البتہ ان کے لوٹ جانے کے بعد ہم اپنے لشکر کی تشکیلِ نو پر توجہ دیں گے۔"

"آپ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ بعد کی بات ہے۔" ملک اسماعیل نے قدرے سرد لہجے میں کہا۔ "مگر فی الوقت آپ کا یہ فیصلہ سلطانِ دہلی کی شان کے خلاف ہے، اس طرح عوام کی نگاہ میں سلطانِ معظم کی تکریم متاثر ہوگی۔"

"کچھ بھی ہو......مگر فی الحال ہمارا فیصلہ یہی ہے۔" سلطان نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ "اب اسی پر عمل کیا جائے گا۔" یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر محفل کے برخاست ہونے کا اشارہ کیا اور تمام امراء سر جھکائے اُلجھن بھری سوچوں کے ساتھ ایوان سے اٹھ گئے۔

ترمہ شیریں خان کے لشکر انداز ہوتے ہی سلطان نے اپنے فیصلے کے مطابق مقابلے کی بجائے عجز و انکسار اختیار کرتے ہوئے زر و جواہر کثیر مقدار میں ترمہ شیریں کی خدمت میں پیش کئے۔ ترمہ شیریں یہ زر و جواہر بٹور کر واپسی کے لئے روانہ ہوا لیکن گجرات پہنچ کر اس نے پھر لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا اور سیکڑوں لوگوں کو بندی بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔

سلطان محمد تغلق کے اس فیصلے میں حکمت و دور اندیشی کا دخل تھا۔ وہ اپنے لشکر کی حالت سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس وقت اس کی فوج ترمہ شیریں کی زبردست فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ دوسرے وہ اپنے اس عمل سے ترمہ شیریں سے جنگ کی بجائے دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا آرزومند تھا اور اس کی معاونت حاصل کر کے خراسان پر حملے کا ارادہ رکھتا تھا۔

مگر اس کے ارادوں اور منصوبوں سے بے خبر رعایا کو اس کے ترمہ شیریں کو تحفے تحائف دینے کے فیصلے پر سخت مایوسی ہوئی۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کا بیٹا تھا، جس نے منگولوں سے کم وبیش 29 معرکے سر کئے تھے اور ان معرکوں میں فتح حاصل کر کے "غازی ملک" کا خطاب پایا تھا۔ اُسی فاتح نڈر غازی ملک کے بیٹے محمد تغلق سے کسی کو اس بزدلی کی توقع نہ تھی۔ عوام کے دلوں میں سلطان کے خلاف بددلی اور



بداعتمادی پیدا ہوگئی جو آگے چل کر حکومت کے لئے بہت مضر ثابت ہوئی۔

جبکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی۔ سلطان محمد تغلق ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ایک نیک نفس، پاکیزہ فطرت انسان تھا۔ قدرت نے اُسے بلا کا ذہن اور حافظہ عطا کیا تھا۔ قرآن کریم کے حافظ ہونے کے علاوہ فقہ اور حدیث کی بڑی بڑی کتابیں اُس کے ذہن میں حرف بہ حرف محفوظ تھیں۔ وہ ایک بہترین خوش نویس تھا۔ اُسے خطاطی میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ بڑے علمائے دین اس سے دینی مسائل پر گفتگو کرتے وقت تامل کرتے تھے۔ اُسے علم طب، ریاضی، قانون، منطق، نجوم اور تصوف سے گہری مناسبت تھی۔ اُسے علم طب سے خاص طور پر شغف تھا۔ وہ اکثر مریضوں کو خود دیکھا کرتا تھا اور اطباء سے طبی مسائل پر بحث بھی کیا کرتا۔

سلطان محمد تغلق تخت پر متمکن ہونے سے قبل مختلف عہدوں پر فائز رہ چکا تھا، متعدد مہمات سر کر چکا تھا، اس لئے اسے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے ہی کافی انتظامی تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ بغاوتوں کے سدِّ باب، مہمات کی پیچیدگیوں اور فرائض سلطانی سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہونے کی وہ بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔

مگر اُسے یہ معلوم نہ تھا کہ تختِ دہلی اس کے لئے روزِ اوّل سے ہی کانٹوں بھرا ثابت ہوگا۔ اس نے رعایا کے دل موہ لینے اور امراء کو خوش کرنے کی خاطر نہایت فراخدلی سے انعامات واکرامات کی بارش کی تھی اور پھر ترمہ شیریں خان کی خدمت میں پیش کئے گئے بیش بہا تحائف اور زر وجواہر کی وجہ سے خزانہ تقریباً خالی ہو چکا تھا، چنانچہ شاہی خزانے کو ازسرِ نو بھرنے کے لئے سلطان نے بہت سی تجاویز اور منصوبوں پر غور کیا اور بالآخر ان پر عمل کرنے کی ٹھانی۔

"مگر سلطان معظم۔" ملک اسماعیل نے اس کا حکم سن کر تذبذب بھرے لہجے میں کچھ کہنا چاہا۔

"بس……" سلطان نے ہاتھ اُٹھا کر دوٹوک لہجے میں کہا۔ "ہم نے مالیہ کی شرح میں اضافے کے لئے صرف دوآبہ (گنگا وجمنا کا درمیانی علاقہ) کو منتخب کیا ہے…… یہ علاقے ہند کے دیگر علاقوں کی نسبت زیادہ زرخیز اور خوشحال ہیں۔ یہ صوبہ مالیہ کے اضافے کے بوجھ کو باآسانی برداشت کر سکتا ہے۔"

چنانچہ دوآبہ میں مالیہ میں گنا زیادہ مقرر کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے کئی اور بھی ٹیکس عائد کئے۔ ممکن تھا کہ سلطان کا یہ فیصلہ کامیاب اور سودمند ثابت ہوتا مگر سلطان نے دوآبہ کے تازہ حالات سے باخبر ہوئے بنا، یہ اضافہ اس وقت کیا جب دوآبہ میں قحط کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس نے محکمۂ مالگزاری کے افسروں کو متعین کرتے وقت زیادہ احتیاط سے کام نہ لیا چنانچہ نئے افسران نے بددیانتی کی اور لگان کی وصولی کے سلسلے میں ظلم وتشدد سے کام لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاشتکار اس بھاری بوجھ کو برداشت نہ کر سکے، انہوں نے پریشان ہو کر زراعت چھوڑ دی اور افسران مالگزاری کے تشدد سے بچنے کے لئے مویشی اور گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے۔ اس طرح دوآبہ کی زرخیزی اور خوشحالی غائب ہوگئی اور سلطان کی یہ منصوبہ بندی ناکام ثابت ہوئی۔

دوآبہ کے بگڑے ہوئے حالات دیکھ کر سلطان نے رعایا کی بھرپور مدد کرنے کی کوشش کی۔ ان کو بیج، کھاد اور قرضے دیئے گئے، آب پاشی کے لئے نئے کنویں کھدوائے گئے لیکن ان تمام امدادی کارروائیوں کے باوجود دوآبہ کے بگڑے ہوئے حالات درست نہ ہو سکے اور ہزاروں افراد قحط، وباء اور فاقوں سے مر گئے۔ دوآبہ کے قحط کی وجہ سے دہلی میں بھی اناج کی قیمتیں اتنی چڑھ گئی تھیں کہ اناج کا ملنا محال ہو گیا۔

ایک طرف یہ حالات تھے۔ دوسری طرف مخدومہ جہاں اپنی بیٹی خداوندزادہ کے ہاتھ پیلے کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ ایک عرصے تک مخدومہ جہاں، خاوند اور بیٹے کی حادثاتی موت پر ماتم کناں رہی تھی۔ غیاث الدین تغلق سے وہ دل کی گہرائیوں سے محبت کرتی تھی اور اس کے بغیر ایک دن بھی زندہ رہنے کا تصور نہ کر سکتی تھی مگر سچائی یہی تھی کہ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا۔ گزرتا ہوا وقت بڑے سے بڑا زخم بھی مندمل کر دیتا ہے۔ سو گزرتی گھڑیوں نے مخدومہ جہاں کے غم کو ختم تو نہیں کیا مگر کم ضرور کر دیا تھا۔ اب وہ سلطان غیاث الدین اور لاڈلے بیٹے کی موت کو بھول کر بیٹی کی شادی کی فکر میں لگ گئی تھی۔

"جونا خان، میں چاہتی ہوں، جلد از جلد خداوندزادہ کو اپنے گھر بار کا کر دیا جائے۔" اس شام وہ خاص طور پر سلطان سے اسی موضوع پر بات کرنے آئی تھی۔

"کیا اس سلسلے میں آپ نے کوئی رشتہ دیکھا ہے؟" سلطان تغلق نے ماں سے سوال کیا۔

"تمہاری بہن جب 12 برس کی تھی، اس وقت سے تمہارے بابا جان نے اس کے لئے رشتے دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔" مخدومہ جہاں نے دھیمی آواز میں بتایا۔ "اور اس سلسلے میں انہوں نے اپنے ایک قرابت دار کے بیٹے سیف الدین کو پسند بھی کر لیا تھا۔"

"اچھا……" سلطان دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ "یہ تو بہت خوشی کی بات ہے، اگر رشتہ موجود ہے تو پھر دیر کی کیا وجہ ہے…… آپ جب حکم کریں، شادی کا انتظام کر دیا جائے گا۔"

گو کہ شاہی خزانہ کسی بھی غیر ضروری خرچ کا متحمل نہ ہو سکتا تھا، اس کے باوجود خداوندزادہ کی شادی نہایت دھوم دھام اور شاہانہ انداز سے کی گئی تھی کہ اہلِ شہر برسوں اس شادی کا تذکرہ کرتے رہے۔

☆……☆……☆

سلطنت دہلی کی حدود میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ ایک طرف شمال مغربی ہند سلطنت دہلی میں شامل تھا تو دوسری طرف سلطنت کی حدود گجرات کاٹھیاواڑ اور بنگال سے ہوتی ہوئی دریائے نربدا تک جا پہنچی تھیں۔ اس وسیع وعریض مملکت کی وجہ سے دہلی سلطنت کا مرکز نہ رہا تھا۔ یہاں سے دوار سمدر اور تلنگانہ جیسے دور دراز علاقوں کا انتظام مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ دوسرے شمالی ہند منگولوں کے حملوں کی زد میں تھا۔ دہلی پر آئے دن منگولوں کے حملے ہوتے رہتے تھے۔ ان خطرات کے علاوہ شمالی ہند میں طوفان اور سیلاب بھی آتے رہتے تھے چنانچہ شمالی ہند کے غیر محفوظ حالات اور دن بدن کم ہوتی اہمیت کے پیش نظر دارالسلطنت کو کہیں اور منتقل کرنے کا خیال سلطان کے دل میں آیا۔

اور بہت غور وخوض کے بعد اس نے دیوگری کے مقام کو اس مقصد کے لئے منتخب کیا۔ اس لئے کہ یہ دہلی، گجرات اور لکھنوتی سے 700 میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ سلطان جنوبی ہند کو فتح کر کے براہ راست اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کے خیال میں دکن سے نزدیک رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی دکن سے دوری کا ہی نتیجہ ہے کہ کرناٹک اور مدورا کے گورنروں نے بغاوت پر کمر باندھ رکھی ہے۔ دوسرے سلطان دکن میں اشاعت اسلام کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے سے ہندو آئے دن کی بغاوت سے باز رہنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ دیوگری کو اسلامی دنیا کا مرکز بنانا چاہتا تھا۔

ان تمام باتوں کو مدنظر رکھ کر اس نے دیوگری کو حکومت کا مرکزی مقام بنانے کے احکامات جاری کر دیئے۔ یہ خبر اہلِ دلی پر بجلی بن کر گری۔

"یہ سب بھلا کس طرح ممکن ہوگا؟" امراء ووزراء نے سلطان کو سمجھانا چاہا۔ "فاصلہ طویل، راستہ دشوار گزار اور سفر جان لیوا ثابت ہوگا۔"

"راستے تعمیر کروائے جائیں، راستوں پر دو رویہ درخت لگوائے جائیں، جابجا کنویں کھدوائے جائیں، مسافروں کو سفر کی دیگر سہولتیں بھی دی جائیں مگر دلی سے دارالحکومت دیوگری ضرور منتقل ہوگا۔"

"مگر سلطان معظم، درخت اتنی جلد اس قدر اونچے نہیں ہوں گے کہ سایہ فراہم کر سکیں اور راستوں کی تعمیر میں بھی وقت لگے گا۔"

"سب کچھ جلد از جلد کرنے کی کوشش کی جائے۔" سلطان نے دوٹوک لہجے میں حکم صادر کیا۔ "ہم گھڑی کی چوتھائی میں دیوگری کو سلطنت دہلی کا دارالسلطنت دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"آپ نے تمام علماء ومشائخ، امرائے دربار اور عمائدینِ شہر کو دکن جانے کا حکم دیا تھا۔" بوڑھے ملک اسماعیل نے دھیمے لہجے میں بتایا۔ "مگر ان میں سے بعض علماء نے انکار کر دیا ہے۔"

"حکم عدولی کرنے والوں کے ساتھ سختی کی جائے۔" سلطان نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

خواص کے علاوہ عوام کے لئے بھی یہ حکم قابلِ قبول نہ تھا۔

"کچھ سنا تم نے بندے خان، سلطان کا حکم ہے کہ دہلی کا ایک ایک فرد دیوگری کے لئے روانہ ہو جائے۔"

ڈھلتی شام اور اُترتی رات کے سنگم پر بندے خان دودھ فروش کی دکان پر دلی کے بانکے جمع تھے۔ مٹی کے آب خوروں میں گرم دودھ پیتے اور باتوں میں مشغول رہ کر گھڑی دو گھڑی بعد سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تھے۔

"ہاں، ابا نے بتایا، پر میں نے تو صاف انکار کر دیا۔" کرخندار تبو نے ہاتھ نچا کر جواب دیا۔ "لو بتاؤ، قسم اللہ پاک کی، یہ بھی کوئی بات ہے۔ اپنا گھر بار، نوکری، کاروبار سب چھوڑ چھاڑ، کوسوں پار دیوگری جا بسو…… مجھے تو یہ سلطان باؤلا معلوم دیتا ہے۔"

"کیا بکتا ہے بدبخت……" درباری دربان نیاز اللہ اتفاق سے وہاں موجود تھا۔ ڈپٹ کر بولا۔ "سلطان کو اگر بھنک بھی پڑ گئی تو تیری کھال اُدھڑوا کر بھس بھروا دے گا۔"

"بہت دیکھے ایسے سلطان۔" تبو کی بجائے دودھ فروش بندے خان تحقیر بھرے لہجے میں بولا۔ "میں تو اس کے منہ پر بھی کہنے سے نہ چوکوں…… وہ بزدل اور خبطی انسان ہے، اس کا ہر فیصلہ بے وقوفی اور کم عقلی پر مبنی ہوتا ہے، جس کا نتیجہ سوائے خفت اور مالی خسارے کے کچھ نہیں۔"

"تم لوگوں کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔" دربان کانوں کو ہاتھ لگاتا اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرا دل چاہتا ہے، یہ سب باتیں لکھ کر سلطان کو پہنچاؤں…… اُسے پتہ تو چلے، اہلِ دلی اس کے لئے کیا رائے رکھتے ہیں؟"

"لکھنے کو تو میں ابھی لکھ دوں۔" بندے خان مسکرایا۔ "مگر سوال یہ ہے کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟ یہ رقعے سلطان تک پہنچائے گا کون؟"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" تبو پُریقین لہجے میں بولا۔ "تم بس لکھ دو، پہنچانے کی ذمے داری میری۔" اس کی نگاہیں گلی میں دور جاتے ہوئے درباری دربان نیاز اللہ پر جمی ہوئی تھیں۔

اور دو روز بعد سلطان کو اپنی خواب گاہ میں کچھ ایسے رقعے پڑے ہوئے ملے تھے جن میں سلطان کو پاگل، جنونی، خبطی، سرپھرا اور بزدل لکھنے کے علاوہ مغلظات کا بھی فراوانی سے استعمال کیا گیا تھا۔

"ان بدبختوں کی یہ جرأت؟" سلطان رقعے پڑھ کر غصے سے آگ بگولا ہو اٹھا۔ "وہ سلطانِ ہند کو گالیوں اور مغلظات سے پُر رقعے بھجوا رہے ہیں؟"

"دراصل وہ دلی سے جانا نہیں چاہتے۔" ملک تیمور خان نے دبی زبان میں بتایا۔

"مگر اب دلی کے ایک ایک فرد کو دولت آباد جانا ہوگا۔" سلطان نے غیظ وغضب بھرے لہجے میں حکم دیا۔ "دلی کے ایک ایک باسی کو مع پالتو جانوروں کے تین دنوں کے اندر اندر دلی کو خالی کر دینا ہوگا۔"

اس حکم پر سوائے چند معذور افراد کے جو چل پھر نہ سکتے تھے، بقیہ تمام لوگ دہلی کو چھوڑ کر جانے پر مجبور ہو گئے…… مگر کچھ لوگ فرار ہو کر سلطان کے رشتے کے بھائی ملک بہاؤ الدین گرشاشپ کے پاس ساگر میں جا پناہ گزین ہوئے۔

سلطان کو خبر ہوئی تو اس نے گرشاشپ اور اس کے قریبی دوست بہرام ایبہ کشلو خان کو بھی دولت آباد پہنچنے کا پروانہ جاری کر دیا۔

سلطان نے انتقالِ دارالحکومت کے لئے بے شمار انتظامات کروائے تھے۔ سڑکیں اور شاہراہیں تعمیر کروائی گئی تھیں، دو رویہ درخت لگوائے گئے، اسباب وافراد کے نقل وحمل کی سہولتیں فراہم کی گئیں مگر ان تمام انتظامات کے باوجود دلی چھوڑ کر دیوگری جانے والے مسافروں کے لئے یہ سفر سہل ثابت نہ ہوا اور اکثر لوگ منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں ہی لقمۂ اجل بن گئے، ہزاروں افراد وباء اور بیماریوں کا شکار ہو گئے، کچھ لوگوں نے دوبارہ دلی کی طرف جانا چاہا مگر اب دلی ویران اور برباد ہو چکی تھی…… وہ شہر جو کبھی قاہرہ اور بغداد کا ثانی تھا، اب اُجاڑ ہو چکا تھا۔ اس کے نواحی علاقوں کے تمام گاؤں جو پانچ میل کے احاطے میں تھے، ویران ہو چکے تھے۔ یہاں تک کہ آدمی کا تو ذکر کیا، کتا اور بلی تک دکھائی نہ دیتے تھے۔

مگر سلطان کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا۔ دولت آباد (دیوگری) پہنچنے پر پایہ تخت دہلی کے لوگوں کو وہاں کی آب وہوا اور بود وباش راس نہ آسکی…… وہ دکن کے باشندوں میں گھل مل نہ سکے، ان کے عزیز واقرباء اُن سے خاصے فاصلے پر شمال میں رہ گئے تھے۔ تمام سہولتوں کے باوجود دیوگری میں وہ دلی والی بات کہاں تھی، لہٰذا ایک ہیجان سا برپا ہو گیا…… ایسا طوفان اُٹھا کہ جس میں سلطان کا منصوبہ اور فیصلہ بے مایہ تنکے کی طرح بہہ گیا اور اُسے مجبوراً دوبارہ پایہ تخت کو دہلی لے جانے کا حکم صادر کرنا پڑا۔

گو کہ لوگ دوبارہ دلی میں آ کر آباد ہو گئے مگر دلی اپنی پہلی والی حالت میں نہ آسکا اور وہ پرانی دلی والی شان اختیار نہ کر سکا اور جانی ومالی نقصان کی تلافی بھی ممکن نہ تھی…… دورانِ سفر ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اُتر گئے تھے…… گھر کے گھر ویران ہو گئے تھے۔

انہی دنوں جب سلطان دولت آباد اور دہلی کے جھگڑے میں اُلجھا ہوا تھا، ملک بہاؤ الدین گرشاشپ نے اس کو غیاث الدین تغلق کا وارث ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ گلبرگہ کے نزدیک ساگر کا حاکم تھا، اُس نے سلطان کی حکومت سے برگشتہ ہو کر علم بغاوت بلند کر دیا۔

گرشاشپ نے ساگر کے قلعے کو بے حد مضبوط کر لیا تھا۔ اس کے پاس ہاتھیوں کی کثیر تعداد موجود تھی اور بہت قلیل مدت میں اس نے ایک بڑا لشکر تیار کر لیا تھا۔ اس نے دکن کے اکثر امراء کو بھی ساز باز کر کے اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ اس طرح اس کی طاقت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔

بہاؤ الدین گرشاشپ، سلطان غیاث الدین تغلق کے چچیرے بھائی علاؤ الدین کا بیٹا تھا۔ علاؤ الدین کیونکہ اس کا ہم عمر اور بچپن کا ساتھی تھا، ساتھ ہی وہ اس سے ایک خاص اُنسیت اور محبت رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ غیاث الدین نے ہمیشہ اُسے مثل سگے بھائی کے عزت ومحبت دی تھی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا۔ "موت نے مجھ سے میرا بھائی رجب خان چھین لیا مگر زندگی نے مجھے علاؤ الدین گرشاشپ جیسا بھائی پھر سے عطا کر دیا تھا۔"

غیاث الدین، علاؤ الدین کے بیٹے بہاؤ الدین گرشاشپ اور اس کے لواحقین سے بھی خاص تعلق رکھتا تھا۔ غیاث الدین کی زندگی میں ہی علاؤ الدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد غیاث الدین نے اس کا عہدہ جاگیر اور صوبہ بہاؤ الدین گرشاشپ کو عطا کر دیا تھا۔

غیاث الدین تغلق کی حادثاتی موت کے بعد دونوں گھرانوں میں پہلی سی یگانگت اور باہمی محبت باقی نہ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گرشاشپ اپنی بیٹی نسترن بانو بیگم کی شادی جونا خان سے کرنے کا خواہشمند تھا۔ اس سلسلے میں وہ خود مخدومہ جہاں کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔

"چچی جان، ان دونوں خاندانوں میں جو یگانگت اور محبت ہے، میں چاہتا ہوں اس میں مزید اضافہ ہو۔" اس نے خوشامدی لہجے میں بات کا آغاز کیا تھا۔ "اور اسی لئے میری خواہش ہے کہ میری بیٹی نسترن بانو آپ کے گھر کی بہو بنے۔"

"مگر…… تم تو جانتے ہو…… بہرام خان اور نصرت خان کی شادیاں ہو چکی ہیں۔" مخدومہ جہاں نے اچنبھے بھرے لہجے میں کہا تھا۔ "تو پھر…… اب……؟"

"جی نہیں، آپ غلط سمجھیں۔" بہاؤ الدین گرشاشپ جلدی سے بولا۔ "میں بہرام خان اور نصرت خان کی بات نہیں کر رہا بلکہ میں……" وہ لحظہ بھر کو تھما، پھر تیزی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔ "میں جونا خان کی بات کر رہا ہوں۔"

"اوہ……!" مخدومہ جہاں کے ہونٹ پُرتشویش انداز میں سمٹ گئے…… وہ جونا خان کا جواب جانتی تھی…… سو اس نے گرشاشپ کے گوش گزار کر دیا۔

"آپ، اس سے بات کر کے تو دیکھیں؟" گرشاشپ نے اصرار کیا۔

اور حسبِ توقع جونا خان کے انکار نے گرشاشپ کو سخت ناخوش اور بددل کر دیا۔ کچھ اور عوامل بھی تھے…… سب نے مل کر اُسے بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔

سلطان محمد تغلق نے گرشاشپ کی سرکشی اور بغاوت کو کچلنے کی خاطر والیٔ گجرات خواجہ جہاں کو چند دیگر امراء کے ساتھ لشکر لے کر روانہ کیا۔

خواجہ جہاں لشکر لے کر دیوگڑھ پہنچا تو گرشاشپ پہلے سے وہاں لشکر انداز تھا۔ اس مقام پر قیامت کا رن پڑا۔ گرشاشپ کے سپاہی جان توڑ کر بہادری سے لڑے اور پہلے دن ہی اس معرکے میں خواجہ جہاں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسرے دن کی لڑائی میں بھی گرشاشپ کا پلہ بھاری رہا۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے سلطان خود فوج لے کر دہلی سے روانہ ہوا۔ سلطان کی آمد کی خبر پا کر گرشاشپ کا سب سے دلیر اور تجربہ کار جرنیل خضر بہرام، گرشاشپ کا ساتھ چھوڑ کر خواجہ جہاں سے جا ملا۔ اس کی اس حرکت سے گرشاشپ کے لشکر میں بددلی اور خوف وہراس پھیل گیا۔ خواجہ جہاں کے لشکریوں کے حوصلے بڑھ گئے…… نتیجے میں گرشاشپ نے راہِ فرار اختیار کرنا ہی مناسب سمجھا۔ وہ میدانِ جنگ چھوڑ کر ساگر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

سلطان کا لشکر خواجہ جہاں کے لشکر سے آملا، قوت دو چند ہو گئی اور حوصلے آسمان کو چھونے لگے…… لشکر سلطانی نے گرشاشپ کا تعاقب شروع کر دیا۔ گرشاشپ اپنے اہل وعیال کو لے کر کرناٹک کے شہر کنپلا میں روپوش ہو گیا مگر وہاں کے ہندو راجہ نے اُسے گرفتار کر کے خواجہ جہاں کے حوالے کر دیا۔ خواجہ جہاں نے اسے دربارِ دہلی روانہ کر دیا۔

☆……☆……☆

محرابی دروں والا مستطیل نما ہال اس وقت درباریوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ سامنے تختِ شاہی پر جلوہ افروز سلطان محمد تغلق کا چہرہ غیظ وغضب سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ آج ایک غدار کو سزا سنائی جانے والی تھی۔

"باغی گرشاشپ کی کھال کھینچ دی جائے…… اور اس کی بے گور وکفن لاش ہر صوبے، ہر پرگنے میں گھمائی جائے تاکہ لوگوں کو عبرت حاصل ہو۔"

سلطان کے حکم پر فوراً عمل کیا گیا۔ زندہ گرشاشپ کے جسم سے کھال کھینچ کر اس کی نعش کو شہر شہر، نگر نگر پھرایا گیا۔

اور جب یہ لاش گورنر ملتان بہرام ایبہ کشلو خان کے پاس پہنچی، تو کشلو خان، سلطان کے اس حکم پر سخت برہم ہوا۔ اس نے بہاؤ الدین گرشاشپ کی نعش عزت واحترام سے دفنا دی۔

"مگر سلطان کا تو…… حکم تھا کہ……" سلطان کے افسران ہراساں تھے۔

"سلطان سے کہہ دینا کہ تمام انتقامی کارروائیاں زندہ انسانوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔ مرنے والوں کا معاملہ خدا کے ساتھ ہوتا ہے۔"

سلطان کے پاس اس کا پیغام پہنچا تو سلطان نے خفا ہو کر اسے اپنے دربار میں طلب کیا مگر کشلو خان نے دربار میں حاضر ہونے کی بجائے علم بغاوت بلند کر دیا۔

سلطان فوج لے کر ابوہر کے میدان میں پہنچا۔ یہاں کشلو خان سے معرکہ ہوا۔ سلطان نے دورانِ جنگ حیلہ سازی سے کام لیا۔ اس نے میدانِ جنگ میں عماد الدین نامی ایک شخص کو جو سلطان سے مشابہ تھا، گھوڑے پر سوار کر دیا اور خود ابوہر کی ترائی میں آم کے باغات میں تاک لگا کر بیٹھ گیا۔

اس کا ہم شکل جنگ میں مارا گیا۔ جب کشلو خان ایک فاتح کی صورت میں واپس لوٹنے لگا تو سلطان اپنی کمین گاہ سے نکل کر کشلو خان پر حملہ آور ہوا اور اسے قتل کر ڈالا۔

بہرام ایبہ کشلو خان کی کھال کھنچوا کر ہاتھیوں کے سامنے ڈال دیا گیا۔

☆……☆……☆

سلطان اور رعایا کے مابین فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔

"تم دیکھتے ہو فیروز۔" سلطان اکثر فیروز خان سے شکوے بھری آواز میں کہتا۔ "میں اپنی رعایا کی بھلائی اور ترقی کے لئے جو اقدامات کرتا ہوں، وہ اسے غلط سمجھتے ہیں۔"

فیروز خان کو اپنے عزیز از جان بھائی سے ہمدردی تھی۔ اس کی ناکامیوں پر اسے افسوس ہوتا تھا مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ سلطان نے اپنی ضد، ہٹ دھرمی، درشتی اور انتہا پسندی کے باعث سب کو ہی اپنا دشمن بنا لیا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں صوفیائے کرام اور افسرانِ حکومت کو سماج میں بہت اونچا درجہ حاصل تھا۔ ان دو طبقوں کے ہاتھ میں دین ودنیا کی باگ ڈور تھی، صوفیائے کرام مذہبی پیشوا تھے تو افسرانِ حکومت اور امراء نظامِ حکومت کے ستون تھے جن کے سہارے کے بغیر حکومت کی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔

مگر سلطان محمد تغلق نے اپنی غلط سوچ کے باعث ان دونوں طبقوں کی مخالفت مول لے لی تھی۔ وہ اپنے باپ غیاث الدین تغلق کی طرح صوفیائے کرام کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ دوسری طرف وہ علاؤ الدین خلجی کی طرح امراء اور جاگیرداروں کو اپنے پنجے تلے دبا کر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کی اس کوشش اور خواہش نے امراء وجاگیرداروں کو بھی اس سے برگشتہ کر دیا تھا۔

☆……☆……☆

سلطان محمد تغلق اپنی مالی حالت کو مضبوط بنا کر مہمات خراسان اور قراچل کے لئے ایک زبردست فوج تیار کرنے کا متمنی تھا۔ شاہی خزانہ اس کی سخاوت، انعام واکرام کی بارش، دوآبہ کے قحط، دارالحکومت کی تبدیلی اور منگولوں کو زرِ کثیر دینے کی وجہ سے خالی ہو گیا تھا چنانچہ اس نے علامتی سکوں کے اجراء کا منصوبہ بنایا۔ (جاری ہے)

اس منصوبے میں اس کی جدت پسندی کا بھی دخل تھا۔ وہ نت نئے تجربوں کا شائق تھا۔ اس زمانے میں چین اور فارس میں علامتی سکوں کا دستور رائج تھا، وہاں کاغذ کے نوٹ چل رہے تھے، لہٰذا سلطان نے کاغذ کی بجائے تانبے کے سکے رائج کرکے انہیں زرِ مبادلہ کے طور پر جاری کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے اس منصوبے میں ضرور کامیاب ہوگا۔

سلطان محمد تغلق

اشتیاق فاطمہ عظمیٰ

آخری قسط



محمد بن تغلق کا علامتی سکے ڈھالنے کا یہ منصوبہ گرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دوراندیشی پر مبنی تھا لیکن یہ اسکیم چند بنیادی غلطیوں کے باعث کامیاب ثابت نہ ہوسکی۔ اگرچہ اس کے اس منصوبے سے اس کی دُوراندیشی اور اپنے زمانے سے بہت آگے کی سوچ کا پتہ دیتی ہے لیکن اس منصوبے کے ناکام ہونے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس نے رعایا کی ذہنی حالت اور زمانے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی مناسب اور ضروری عملی تدابیر اختیار کیں۔ اس نے سکوں کو جاری کرتے وقت حکومت کی طرف سے جعلی سکوں کی روک تھام کا کوئی خاص انتظام نہ کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ہندو کا گھر ٹکسال بن گیا اور ملک میں جعلی سکے بننے لگے۔

لوگ اب انہی جعلی سکوں سے تمام اشیائے ضرورت کی خرید و فروخت کرنے لگے۔ ہاتھی، گھوڑے، زمین، جائداد، باغات اور اسلحہ، سب ہی کچھ انہی جعلی سکوں سے خریدے جانے لگے اور انہی سکوں سے مالیہ اور ٹیکس کی ادائیگی بھی ہونے لگی۔

چنانچہ ان حالات نے حکومت کی مالی حالت، ملکی تجارت اور کاروبار پر گہرے منفی اثرات مرتب کئے، خاص طور پر شاہی خزانے کو ازحد نقصان پہنچا، سرکاری سکوں کی ساکھ اُٹھ گئی اور اندرون و بیرون ملک تاجروں نے انہیں مقررہ قیمت پر لینے سے انکار کردیا۔

☆......☆......☆

ڈوبتے سورج کی زرد کمزور کرنیں قصر شاہی کے اونچے برجوں کو الوداعی بوسہ دیتی رخصت ہورہی تھیں۔ شام کے اُترتے ہی قصر شاہی کے دروازوں پر جو چہل پہل اور گہما گہمی جاگ اٹھتی تھی، آج اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔

آج سلطان اپنے ایوان خاص میں سر جھکائے، متفکر اور رنجور بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے اس کے دونوں بوڑھے وزیر جو خزانہ اور مالی امور سنبھالتے تھے، سر جھکائے فکرمند کھڑے تھے۔

''اور تجار کا کیا موقف ہے؟''...... کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد سلطان نے دھیمی آواز میں سوال کیا۔

''سلطان معظم، تاجروں نے علامتی سکوں کو مقررہ قیمت پر لینے سے انکار کردیا ہے، اگر یہی صورت کچھ عرصے اور رہی تو ملک کا تمام اقتصادی نظام درہم برہم ہوجائے گا۔'' وزیر خزانہ نے وحشت زدہ لہجے میں بتایا۔

''اور ساتھ ہی ملک پر غدر اور قحط و تباہی کے بادل چھا جائیں گے۔'' ملک اسماعیل نے ہراساں لہجے میں بات آگے بڑھائی۔

سلطان حسب سابق سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔

''آپ کو اس سلسلے میں کوئی حتمی قدم اٹھانا ہوگا۔'' اسے خاموش دیکھ کر کچھ توقف کے بعد ملک اسماعیل نے دوبارہ زبان کھولی۔ ''ورنہ پانی سر سے اونچا ہوجائے گا......''

سلطان کے چہرے پر دھیرے دھیرے افسردگی کی جگہ غصہ چھاتا جارہا تھا۔ وہ اپنی رعایا کی بھلائی کے لئے جو منصوبہ بناتا تھا، وہ سب مل کر اُسے ناکام کردیتے تھے...... کئی لمحوں تک وہ اپنے دل میں سر اٹھاتی غصے اور نفرت کی لہروں کو دبانے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر بے حد دھیمی مگر فیصلہ کن آواز میں گویا ہوا۔ ''علامتی سکے بند کردیئے جائیں۔''

''کیا مطلب......؟'' دونوں وزراء حیران رہ گئے۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ سکے بند کردیئے جائیں...... تو پھر...... سلطان معظم، اس طرح تو......''

''علامتی سکے بند کرنے کے ساتھ ہی یہ بھی اعلان کردیا جائے کہ جس کسی کے پاس بھی علامتی سکے ہوں، وہ ان کے بدلے خزانہ شاہی سے چاندی کے سکے لے لے۔''

سلطان کے اس حکم کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے اور بھی زیادہ جعلی سکے ڈھال کر شاہی خزانے سے اپنی جھولیاں بھریں۔ شاہی خزانے کے باہر جعلی سکوں کا ایک پہاڑ سا کھڑا ہوگیا اور اس طرح باقی ماندہ خزانہ بھی خالی ہوگیا تھا اور ملک کی اقتصادی حالت بالکل تباہی کے دہانے پر جا پہنچی۔

☆......☆......☆

کچھ عرصے میں ملکی اقتصادی حالت کچھ بہتر ہوئی تو سلطان کا فتوحات عالم گیری کا شوق بیدار ہوا۔ علاء الدین خلجی کی طرح، محمد تغلق بھی سکندر اعظم کی طرح فتوحات عالم کا خواہشمند تھا۔ خلجی کے پاس مخلص مشیر تھے جنہوں نے اس کو اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے باز رکھا تھا مگر سلطان محمد تغلق کو اس کے برعکس اس کے خوشامدی امراء نے اسے فتوحات عالم گیری کے لئے خوب اُکسایا۔

اُن دنوں خراسان اور عراق کے داخلی حالات اچھے نہ تھے۔ وہاں کا حاکم ابوسعید اپنی رعایا میں بہت غیر مقبول تھا اور اس وقت خراسان اور ایران میں کئی قسم کے تنازعے موجود تھے۔ ان حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے سلطان کو خراسان کی تسخیر کا خیال آیا۔ یہ خیال شروع سے ہی اس کے ذہن میں موجود تھا اور اسی خیال کے پیش نظر اس نے ترمہ شیریں کے ساتھ مصالحت کا برتاؤ کرکے اسے زروجواہر سے مالا مال کرکے واپس بھیجا تھا۔ پھر بعد کو ترمہ شیریں کی مدد حاصل کرنے کی غرض سے اس نے اس کے بیٹے ہاشی اور داماد فیروز کو دہلی آنے پر بڑے عزت و احترام کے ساتھ اپنے پاس رکھا۔ اُس نے خراسان کے امراء کو بھی اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور ان کی معاونت حاصل کرنے کے لئے ان پر زرِ کثیر صرف کیا۔

چنانچہ خراسان پر حملے کی نیت سے سلطان نے سال بھر میں 3 لاکھ 70 ہزار سواروں پر مشتمل ایک بڑی فوج تیار کرلی اور اس فوج کو پورے ایک برس تک خزانہ شاہی سے تنخواہوں کی ادائیگی ہوتی رہی لیکن اس سے پہلے کہ یہ فوج خراسان پر حملہ آور ہوتی، یکایک وہاں کے حالات نے پلٹا کھایا اور ترمہ شیریں قتل ہوگیا...... جس کے باعث ابو سعید کی حالت بے حد مضبوط ہوگئی...... حالات کا رخ یوں بدلتے دیکھ کر سلطان نے خراسان کی تسخیر کا خیال ترک کردیا اور فوج کو ایک سال تک تنخواہ دیتے رہنے کے بعد برخاست کردیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خزانہ شاہی کو ایک ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کا یہ منصوبہ عاقبت نااندیشی پر مبنی تھا۔ اتنے دور افتادہ علاقے کو فتح کرکے دہلی سے ملانے کا خیال، حکومت کی مشکلات اور ذمے داریوں میں غیر ضروری طور پر اضافہ کرنے کے مترادف تھا۔ خراسان کی مہم کا ارادہ ترک کردینے پر حکومت کو مالی خسارہ ہی نہیں ہوا بلکہ اس سے رعایا کے دلوں میں سلطان کے خلاف بددلی اور بداعتمادی بھی پیدا ہوگئی۔

☆......☆......☆

وقت کا پنچھی اپنی مخصوص پرواز کے ساتھ آگے بڑھتا جارہا تھا اور گزرتے ہوئے وقت کا ہر لمحہ رعایا اور سلطان کے مابین موجود خلیج کو بڑھاتا جارہا تھا۔ ملک میں شورشیں پیدا ہورہی تھیں، جابجا بغاوتوں کی آگ بھڑک رہی تھی۔

سلطان کے مزاج کی تختی، درشتی اور انتہاپسندی نے حالات مزید بگاڑ دیئے تھے۔ پھر سلطان نے حالات سدھارنے کی بجائے کچھ ایسے اقدامات کئے، جن کے باعث حالات اور بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔ اس نے بعض پرانے اور زیرک افسروں، گورنروں اور امراء کو ہٹا کر کچھ ناتجربہ کار، نااہل اور نچلے درجے کے لوگوں کو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کردیا تھا۔ اس کا یہ طرزعمل گرچہ نسلی اور طبقاتی امتیاز کو مٹانے کے لئے اخلاقی لحاظ سے قابل تعریف تھا لیکن اس زمانے کے حالات کے مطابق قرین مصلحت نہ تھا۔ چنانچہ اس کی اس عاقبت نااندیشی کے باعث سلطنتِ دہلی کے بعض مخلص اور وفادار کارکن بھی اس سے بدظن اور برگشتہ ہوکر علم بغاوت اٹھانے پر مجبور ہوگئے تھے۔

انہی میں سے ایک عین الملک ملتانی بھی تھا۔ وہ کڑہ کا گورنر تھا۔ وہ سلطان کا ایک تجربہ کار، وفادار اور مخلص ساتھی تھا۔ وہ دوآبہ کے قحط کے دوران سلطان کو غلے کی فراہمی کے سلسلے میں بے حد مددگار ثابت ہوا تھا، یہاں تک کہ جب سلطان مجبور ہوکر اپنے دربار اور عدالت کو فرخ آباد کے ضلع میں منتقل کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ اس وقت بھی عین الملک اور اس کے بھائیوں نے اس کی بے حد معاونت کی تھی لیکن سلطان اس جیسے وفادار اور مخلص ساتھی کی قدر نہ کرسکا اور اپنی غلطیوں اور عاقبت نااندیشی کے باعث عین الملک کو اپنا مخالف کرلیا۔

اس وقت دکن کے حالات بے حد خراب تھے۔ سلطان محمد تغلق نے عین الملک کو حکم بھیجا کہ وہ کڑہ کو چھوڑ کے فوراً اپنے اہل وعیال سمیت دکن چلا جائے۔ اس وقت عین الملک کے پاس چند ایسے لوگ پناہ گزین تھے جو سلطان کے زیرعتاب تھے، ان کی موجودگی میں عین الملک کی فوری تبدیلی کے احکام بھیج کے سلطان نے اس کے دل و دماغ میں شبہات پیدا کردیئے تھے۔

''زین الملک، کہیں ایسا تو نہیں کہ سلطان معظم، مجھے معزول کرنا چاہتے ہیں؟'' عین الملک کے لہجے میں خدشات بول رہے تھے۔ ''ورنہ اس یکایک تبدیلی کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟''

اس سے قبل کہ اس کا بھائی زین الملک اس کی بات کا کوئی جواب دیتا، اس کے پاس پناہ گزین سلطان کے معتوب، ملک التواء نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''یہ تو آپ نے میرے منہ کی بات لے لی...... آپ جیسا سوچ رہے ہیں، بخدا ہو ہوا ایسا ہی ہے۔''

''آپ اتنے یقین سے یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں؟'' زین الملک نے قدرے تذبذب سے جواب دیا۔ ''ہوسکتا ہے ایسا کچھ نہ ہو۔''

''غضب خدا کا...... تم یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہو برخوردار۔'' ادھیڑ عمر ملک التواء قدرے ناراض لہجے میں بولا۔ ''جتنی تمہاری عمر ہے، اس سے زیادہ عمر ہم نے دربار میں گزاری ہے...... ہم سلطان کی پیشانی کے ایک ایک بل کا مطلب اچھی طرح جانتے ہیں اور ایک ایک اشارے کا مفہوم سمجھتے ہیں۔''

غرض کہ عین الملک کی خدشات اور وسوسوں والی اس کیفیت کو بھانپ کر ان معتوب لوگوں نے اس کے شبہات کو مزید پختہ کردیا اور عین الملک کو اندیشہ ہوا کہ وہ کہیں سچ مچ سلطان کے غیظ و غضب کا شکار نہ ہوجائے۔ چنانچہ اس نے علم بغاوت بلند کردیا۔

سلطان اس کی بغاوت کی خبر سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو خواجہ جہاں؟'' اس کے لہجے سے حیرت اور بے یقینی ٹپک رہی تھی۔ ''عین الملک باغی ہوگیا؟''

''جی سلطان معظم۔'' خواجہ جہاں نے سر جھکا کر دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ ''عین الملک اور اس کے ساتھیوں نے علم بغاوت بلند کردیا ہے۔''

''حیرت ہے...... افسوس ہے۔'' سلطان کے لہجے سے کرب اور اضطراب ٹپک رہا تھا۔ ''عین الملک جیسے نمک خوار بھی بغاوت پر آمادہ ہوجائیں تو پھر بھلا ہم کس پر اعتبار کریں......؟''

سلطان کے اس سوال کا خواجہ جہاں کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا جھکا سر کچھ اور جھک گیا۔

''تم دیکھ رہے ہو فیروز خان۔'' سلطان اپنے چہیتے بھائی سے مخاطب ہوا۔ ''تمہارا یہ بھائی دن بدن کس قدر تنہا ہوتا جارہا ہے۔''

اس کے لہجے کے کرب نے فیروز کو تڑپا کر رکھ دیا۔ وہ بولا۔ ''بھائی جان، آپ کا یہ بھائی، یہ نمک خوار ہمیشہ ہر قدم پر آپ کا ساتھ دے گا۔''

سلطان محمد تغلق نے تشکر بھری نظروں سے اپنے 28 سالہ چچیرے بھائی فیروز خان کی طرف دیکھا۔ اب وہ شادی شدہ اور دو بیٹوں کا باپ تھا۔ اس کے باوجود اس کے شب و روز سلطان کے ساتھ گزرتے تھے۔ وہ ہر لحہ سائے کی طرح سلطان کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی محبت اور وفا پر سلطان کو صد درجہ یقین تھا۔

''پھر سلطان معظم کا کیا حکم ہے؟'' خواجہ جہاں، سلطان کے فیصلے کا منتظر تھا۔

''اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ہم خود جائیں گے۔'' سلطان نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ''لشکر کو لام پر جانے کے لئے تیاری کا حکم دے دیا جائے۔''

☆......☆......☆

''کیا......؟ سلطان خود فوج لے کر آرہا ہے؟'' عین الملک ہراساں لہجے میں پوچھ رہا تھا۔

''اور نہیں تو کیا؟'' شہوار خان نے پُریقین لہجے میں کہا۔ ''ہم نہ کہتے تھے...... وہ آپ کو معزول کرکے برباد کرنا چاہتا ہے...... اب وہ قتل سے کم پر کیا راضی ہوگا۔''

ان باتوں نے جنگ سے پہلے ہی عین الملک کے حوصلے پست کردیئے تھے۔ وہ ذہنی طور پر اس جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔ فطرتاً وہ سلطان کا وفادار تھا۔ اب اس کے خلاف ہتھیار اٹھاتے گھبرا رہا تھا۔

اور اس کی اس متذبذب کیفیت نے آخرکار اسے شکست فاش سے دوچار کردیا۔ سلطان نے اس کے ایک ایک ساتھی کو چن چن کر تہہ تیغ کردیا مگر جب اُسے گرفتار کرکے سلطان کے روبرو پیش کیا گیا تو وہ کئی لمحوں تک اس کی طرف شکایتی نظروں سے دیکھتا رہا۔

''عین الملک۔'' چند لمحوں بعد اس کی افسردہ آواز اُبھری تھی۔ ''مجھے اب بھی اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا کہ...... میرا یہ رفیق و وفادار ساتھی...... باغی بھی ہوسکتا ہے۔''

عین الملک کی نگاہیں فرط پشیمانی سے جھک گئیں۔ وہ پست آواز میں بولا۔ ''اس داغ بے وفائی کے باعث، بعد از مرگ میری روح بھی شرمندہ رہے گی۔'' عین الملک کی اس پشیمان آواز میں ایک کرب بھی شامل تھا۔

''ہم تمہاری روح پر شرمندگی کا بوجھ نہیں ڈالیں گے عین الملک۔'' سلطان کے سنجیدہ چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ لرزی۔ ''ہم تمہیں موقع فراہم کریں گے کہ تم اپنی وفاداری ثابت کرکے اپنے دل سے یہ بوجھ اُتار دو۔''

عین الملک ہی نہیں، دربار میں موجود تمام افراد بھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ سلطان نے درگزر اور معاف کردینا تو سیکھا ہی نہ تھا...... آج پہلا موقع تھا کہ وہ ایک باغی کی کھال کھنچوانے کی بجائے معافی کی سوغات دے رہا تھا۔

''ہم عین الملک کی سابقہ خدمات اور وفاداریوں کے صلے میں اسے معاف کرکے شاہی باغات کا نگران اعلیٰ مقرر کرتے ہیں۔''

''سلطان معظم کا اقبال بلند ہو۔'' عین الملک روتا ہوا سلطان کے تخت کے پائے سے جا کر لپٹ گیا تھا۔

☆......☆......☆

دور مشرقی پہاڑی سلسلے کی اوٹ سے صبح کاذب کا دھندلا سا اُجالا سر اُبھار رہا تھا۔ بادنسیم کے نرم جھونکوں میں قصر ہزار ستون کے شاداب باغیچوں میں پھولوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ آشیانوں میں دبکے ہوئے پرندے یکے بعد دیگرے بیدار ہورہے تھے اور ان کی مدھم چہچہاہٹ میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

محمد تغلق تہجد کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد دریچے میں آ کھڑا ہوا تھا۔ گہرے گہرے سانس لے کر اس نے مشکبار اور جان فزا ہوا کو پھیپھڑوں میں اُتارتے ہوئے دور خاکستری پہاڑیوں کی طرف دیکھا۔ ایسی ہی پتھریلی پہاڑیوں اور چٹانوں کے اُس پار کہیں دور...... چین کا علاقہ تھا۔

چین اور برصغیر پاک و ہند کے درمیان قراجل کا علاقہ تھا۔

بالکل اچانک ہی سلطان کے دل میں انوکھا خیال جاگا تھا...... قراجل کے علاقے کی سرکوبی اور تسخیر کا خیال۔

ایک طرف ملک میں قحط سالی، افلاس اور بغاوتوں کا سلسلہ جاری تھا تو دوسری طرف سلطان محمد تغلق فتوحات کے میدان میں جھنڈے گاڑنے اور چین کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا اور جب اس نے اپنے مشیروں کے سامنے اپنے اس خواب کو رکھا تو وہ سب ہکا بکا ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

''سلطان معظم، تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سلاطین دہلی میں سے کوئی ایک بھی چین کی ایک گز زمین بھی اپنے تصرف میں لاسکا ہو۔ اس لئے...... یہ سوچ...... قطعاً سودمند ثابت نہ ہوگی۔'' عمر رسیدہ اور تجربہ کار وزیر ملک اسماعیل نے دبی زبان میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''اگر گزشتہ سلاطین نے چین کی طرف لشکرکشی کے بارے میں نہیں سوچا تو...... کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم بھی ایسا کچھ نہ سوچیں؟'' سلطان محمد تغلق نے کڑے تیور سے سوال کیا۔

''دراصل فاصلہ طویل ہے۔ سفر دشوار گزار اور موسم سخت...... بے آب و گیاہ پہاڑی سلسلے میں راستہ یاد رکھنا بھی ممکن نہیں رہتا، تو ایسے میں......'' خواجہ جہاں کی دھیمی آواز میں پیش کی جانے والی تاویل پر سلطان نے ناگوار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے اپنے مشیروں اور امراء سے اس طرح کی بزدلی کی توقع نہ تھی۔''

درباریوں کے سر جھک گئے...... اب انہوں نے مخالفت کی بجائے مفاہمت میں بولنا شروع کردیا تھا۔

''سلطان معظم بجا فرما رہے ہیں...... آخر ہم شکست کے بارے میں ہی کیوں سوچیں...... اللہ نے چاہا تو فتح ہمارے قدم چومے گی۔''

☆......☆......☆

مخدومہ جہاں نے سلطان کے اس ارادے کے بارے میں سنا تو وہ بے حد فکرمند ہوگئی تھی۔ پچھلے کافی دنوں سے اس کی طبیعت خراب چلی آرہی تھی اور آج کل اس کی بیٹی خداوندزادہ اپنے بیٹوں مسرور اور خسرو ملک کے ساتھ ماں کی عیادت کو آئی ہوئی تھی۔ ماں کو پریشان دیکھ کر وہ تسلی دینے والے لہجے میں بولی۔ ''امی جان! آپ پریشان کیوں ہوتی ہیں...... میں خود بھائی جان سے بات کروں گی...... مجھے امید ہے کہ وہ چین کی فتوحات کا ارادہ ترک کردیں گے۔''

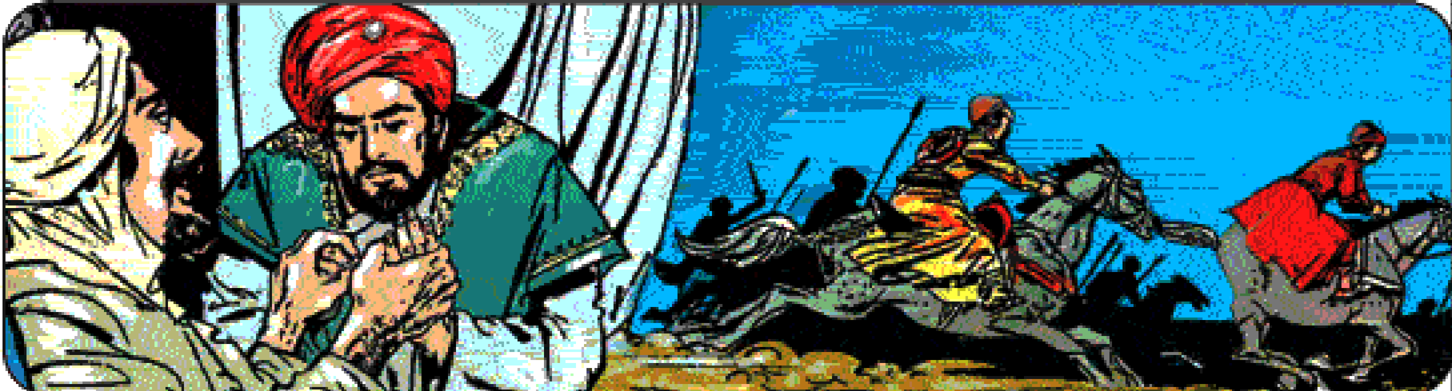
''میں اُسے ارادہ ترک کرنے کے لئے نہیں بلکہ کچھ عرصے رُک جانے کا مشورہ دینا چاہتی ہوں۔'' مخدومہ جہاں نے نقاہت بھری آواز میں کہا۔ ''اب سوچو وہ لشکر لے کے جائے گا...... تو جانے کب لوٹے گا...... اور اب ان بوڑھی آنکھوں میں اتنی سکت کہاں کہ برسوں اس کا انتظار کریں...... کون جانے کب یہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہوجائیں۔''

''خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔'' خداوندزادہ نے تڑپ کر کہا۔ ''آپ ایسی باتیں کیوں سوچتی ہیں؟''

''موت برحق ہے بیٹی۔'' مخدومہ جہاں کے خشک لبوں پر مبہم سا تبسم بکھرا۔ ''موت کو زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا...... مگر میری خواہش ہے کہ جب مجھے موت آئے تو میرا بڑا بیٹا...... میرا جونا خان میرے قریب موجود ہو۔''

اور ماں کی اس خواہش کا احترام کرتے ہوئے سلطان محمد تغلق نے قراجل کی مہم پر خود جانے کا ارادہ ملتوی کرکے اپنے بھانجے خسرو ملک کو لشکر کی سپہ سالاری کے لئے منتخب کیا۔

لشکر کو روانہ کرتے وقت سلطان نے خسرو ملک کو تاکید کی کہ وہ کوچ کرتے وقت اپنے پیچھے فوجی چوکیاں قائم کرتا جائے تاکہ رسد بھیجنے کے انتظام میں خلل واقع نہ ہو اور اسے واپسی پر بھی کسی دقت کا سامنا نہ ہو۔



ایک لاکھ چنیدہ سواروں کا یہ لشکر چین کی طرف روانہ ہوا۔ ترائی تک پہنچتے پہنچتے سالاروں کو اندازہ ہوگیا کہ پہاڑوں میں گھوڑے اور ہاتھی بے مصرف و بیکار ثابت ہوں گے...... ہر طرف خشک اور کھردرے پہاڑ تھے...... گھاس اور چارہ بھی مہیا نہ تھا...... اس پر موسم سخت اور جان لیوا......!

آدھے سے زیادہ لشکر اسی طرف رکنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ ہماچل کو سر کرکے بہت تھوڑے لوگ چین کی سرحد تک جا پائے، جہاں قلعہ بندیاں دیکھ کران کی آنکھیں کھل گئیں لیکن اس سے قبل کہ وہ پیش قدمی کرتے، برسات نے آگھیرا اور وہ بصد مشکل دوبارہ اپنے لشکر کی طرف پلٹے۔ عجب قیامت خیز سماں تھا۔ بارش ایسی طوفانی کہ اس سے قبل کبھی دیکھی نہ سنی...... سیلابی ریلے پہاڑوں سے اُتر کر لشکر کی طرف بڑھے آتے تھے...... انسان تو کیا ہاتھی، گھوڑے بہے جاتے تھے۔ لشکریوں نے ٹیلوں، چٹانوں پر چڑھ کر جان بچائی۔ ابھی اس مشکل سے نجات نہ پائی تھی کہ لشکر میں وبا پھوٹ پڑی اور لشکری چٹاچٹ مرنے لگے۔

آگے پیش رفت ممکن نہ تھی، اسی لئے بیماری کا زور کم ہوتے ہی واپسی کا فیصلہ کیا گیا مگر واپسی بھی آسان نہ تھی۔

ایک لاکھ سواروں کا یہ عظیم لشکر پہاڑوں میں بھٹکتا، فاقوں، بارشوں اور سیلابوں کے ہاتھوں زک اُٹھاتا...... بھوک اور وبا کے ہاتھوں آہستہ روی سے موت کا شکار ہوگیا۔ باقی ماندہ سیلابی ریلوں سے بچتے بچاتے موت سے آنکھ مچولی کھیلتے محو سفر تھے کہ ہماچل کے باشندے کشتیوں پر سوار ہوکر اس مقام پر پہنچے اور تمام اسلحہ، مال واسباب چھین کر سب کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ لشکر کا سپہ سالار، محمد تغلق کا بھانجا خسرو ملک بھی لقمۂ اجل بنا...... اس افتادِ ناگہانی کا شکار ہونے کے بعد گنتی کے چند لوگ واپس دارالحکومت پہنچنے میں کامیاب ہوسکے۔

ایک لاکھ کے لشکر جرار میں سے محض چند افراد کی واپسی سلطان کے غیظ وغضب کو بھڑکا گئی۔

"بدبختو! اگر تم لوگوں کو واپسی کی جلدی نہ ہوتی، تو اتنی ذلت آمیز شکست کا سامنا نہ کرنا پڑتا...... مگر تم لوگوں کے فرار نے پیچھے رہ جانے والوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا۔"

موت سے پنجہ آزمائی کرتے، ہزارہا مشکلیں سہتے، بھوک، بیماریوں اور اذیت ناک سفر سے نمٹتے بصد مشکل دربار تک پہنچنے والے لشکری سر جھکائے، مجرم بنے، ہراساں وخوف زدہ کھڑے تھے۔ جس موت سے دامن بچاتے وہ یہاں تک پہنچے تھے، اب وہ موت انہیں بالکل سامنے دکھائی دے رہی تھی۔

"یہ اپنی جان بچا کر واپس آنے والے تمام لشکری مفرور ہیں...... اپنے ساتھیوں کو تنہا چھوڑ کر فرار ہونے والے ان مجرموں کی سزا بھی موت ہے۔" سلطان نے خونخوار نظروں سے سر جھکائے نادم وہراساں لشکریوں کی طرف دیکھا۔ "ہم انہیں موت کی سزا دیتے ہیں تاکہ عام شہری اور لشکر کے سپاہی عبرت حاصل کرسکیں کہ میدان جنگ میں پیٹھ دکھانے والوں کا انجام آخرکار موت ہی ہے۔"

سلطان محمد تغلق کا یہ منصوبہ بھی ناکامی سے دوچار رہا۔

چین کو فتح کرنے کا خواب تشنۂ تعبیر رہ گیا۔

اس شام وہ اپنے ایوان خاص میں بیٹھا سوچوں میں گم آنے والے وقت کے بارے میں تخیل کے گھوڑے دوڑا رہا تھا کہ ایک خادم نے آکر اطلاع دی تھی کہ مخدومہ جہاں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے اور انہوں نے فوری طور پر سلطان کو بلایا ہے۔

وہ بے اختیار اپنی جگہ سے اُٹھ کر حرم سرا کی طرف چل دیا۔

کمرے میں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مخدومہ جہاں تکیے پر سر دھرے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے نمایاں تھے اور پپڑی زدہ خشک لب ساکت تھے۔ اس نے پلکوں کو ہلکی سی جنبش دے کر نیم وا آنکھوں سے اپنے گرد کھڑے افراد کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں بیٹے بہرام خان اور نصرت خان، بیٹی خداوندزادہ اور بی بی کدبانو، فیروز خان کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

"وہ...... وہ کہاں ہے......؟" اس کے لرزیدہ لبوں سے دھیمی آواز برآمد ہوئی۔

"وہ...... بس آتے ہی ہوں گے۔" فیروز خان نے پُریقین لہجے میں جواب دیا اور اگلے ہی لمحے محمد تغلق دروازے سے اندر داخل ہوا۔

"جونا خان...... میرے بیٹے، میرے لختِ جگر۔" مخدومہ جہاں نے اس کا ہاتھ اپنے بوڑھے اور سرد ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ "میں نے تیری ہر خطا، ہر لغزش بخش دی...... اور...... دودھ بھی بخش دیا...... اب وقت رخصت ہے۔"

"امی جان، آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔" محمد تغلق کو اپنے لفظوں پر آپ اعتبار نہ تھا۔ وہ ایک قابل اور زیرک طبیب تھا۔ اِک نگاہ ڈالتے ہی اُسے اندازہ ہوگیا تھا کہ مخدومہ جہاں جو کہہ رہی ہے، وہ غلط نہیں ہے۔

"امی جان۔" اس نے لرزتے لہجے میں ماں کو پکارا...... مخدومہ جہاں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو آخری بار ذرا سا کھول کر اس کے ہراساں چہرے کی طرف دیکھا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

ایک چھت ٹوٹ کر گری تھی تو اس کا باپ اس سے بچھڑ گیا تھا۔ آج اس کی ماں نے دنیا سے آنکھیں پھیری تھیں تو گویا اس کے سر پہ آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ ماں کی موت اس کے لئے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ ہر دکھ، کرب اور ناکامی کے عالم میں ماں کا دامن ہی تو تھا جو اُسے پناہ دیتا تھا۔ آج وہ دامن ہمیشہ کے لئے اس سے چھن گیا تھا...... آج وہ بالکل تنہا رہ گیا تھا۔

کرب والم کے ان لمحوں میں اگر کوئی اس کے ساتھ تھا تو وہ اس کا چچیرا بھائی ملک فیروز خان تھا۔ اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کرتا، اس کے سر کو اپنے کاندھے پر رکھ کر اُسے تسلی دیتا۔ وہ ہر لمحہ سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔

ابھی محمد تغلق چین کی مہم کی ناکامی اور لشکر کی تباہی پر ماتم کناں تھا کہ ماں کی موت کے اس صدمے نے اس کے دلِ نامراد پر ایک اور کاری ضرب لگادی تھی۔ تین دن تک شہر میں سوگ منایا گیا۔

☆......☆......☆

سلطان محمد تغلق کی حکومت کے چند ابتدائی سالوں میں حکومت بڑی کامیابی سے چلتی رہی۔ سلطنت کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک امن وامان رہا۔ ہر صوبے سے محصولات اور مال گزاری برابر وصول ہوتی رہی۔ اندرونی امن وامان کے علاوہ حکومت بیرونی خدشات سے بھی محفوظ رہی۔ تخت نشینی کے دو سال بعد چند بغاوتیں ہوئیں، جو جلد ہی فرو کردی گئیں اور باغیوں کو سلطان نے عبرتناک سزائیں دیں۔

لیکن دس سال بعد بغاوتوں کا ایک ایسا بے چینی کا دور شروع ہوا جس سے سلطان کو مرتے دم تک چھٹکارہ نہ مل سکا۔

بڑھتی ہوئی عمر اور گزرتے ہوئے وقت نے سلطان کو خاصا مضمحل کردیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں اب اُسے رنجیدہ اور مایوس کردیتی تھیں۔ اُسے اپنی رعایا سے سخت شکایت تھی، جن کی خاطر اس نے اچھے اچھے منصوبے بنائے مگر رعایا نے ایک منصوبہ بھی کامیاب نہ ہونے دیا۔

عوام وخواص کا خیال تھا کہ سلطان ایک جلد باز، عاقبت نااندیش، خود پسند اور ضدی حکمران ہے۔ اس کے منصوبوں کی ناکامیوں کے باعث عوام کے دل سے اس کی عزت کم ہوگئی تھی۔ امراء و گورنر اپنی خودمختاری اور آزاد ریاستوں کا اعلان کر رہے تھے۔

بنگال کے گورنر قدر خان کے اسلحہ بردار فخرالدین نے اُسے قتل کرکے اپنی خودمختار حکومت قائم کرلی تھی۔ سلطان اس وقت چونکہ بہت سی مشکلوں میں گھرا ہوا تھا، اس لئے اس طرف توجہ نہ دے سکا اور بنگال نے خودمختار حیثیت حاصل کرلی۔

محمد تغلق کے عہد میں دکن بغاوتوں کا مرکز تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی سالوں میں سلطان، دکن کے دوردراز علاقوں مثلاً وارنگل، دوارسمدر، دیوگری وغیرہ کو اپنے ماتحت رکھنے میں کامیاب رہا تھا لیکن بعد میں جب بغاوتوں کا وسیع سلسلہ شروع ہوا تو تلنگانہ، دیوگری، دوارسمدر اور دکن کے دیگر علاقے خودمختار ہوتے چلے گئے۔

سلطان محمد تغلق نے مالوہ اور دھار پر ایک ناتجربہ کار فرد عزیز خمر کو جو ایک شراب فروش کا بیٹا تھا، حاکم مقرر کیا تھا۔ وہ امراء کے ساتھ ایسی بدسلوکی کے ساتھ پیش آتا تھا کہ سب کے سب اس سے متنفر اور بغاوت پر آمادہ تھے۔

یہ صورت حال دیکھ کر عزیز نے کوئی 80 کے قریب افغان امراء کو گرفتار کرکے ان کے سر قلم کروادیے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو لیکن اس کا اُلٹا اثر ہوا۔ دیگر امراء نے مشتعل ہوکر اُسے گرفتار کرلیا اور تلوار کے وار سے اُس کا سرتن سے جدا کردیا۔

افغان امراء کے قتل کی خبر جب گجرات پہنچی تو وہاں کے افغان امراء نے نائب وزیر ملک مقبول پر بڑودہ کے مقام پر حملہ کرکے اس کا تمام خزانہ لوٹ لیا۔ اس طرح مالوہ اور گجرات ہر دو جگہ بدامنی پھیل گئی۔ اس کے اثرات ملتان تک پہنچے جہاں شاہو افغان نے وہاں کے گورنر کو قتل کرکے علم بغاوت بلند کیا اور فرار ہوکر گجرات میں افغان امیروں سے جا ملا۔

ان حالات کو قابو میں کرنے اور افغانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے سلطان خود دہلی سے گجرات کے لئے روانہ ہوا اور غم وغصے میں اُس نے اہل گجرات پر شدید سختیاں کیں اور ابھی وہ گجرات اور مالوہ کے حالات پر پوری طرح قابو پانے میں کامیاب نہ ہوا تھا کہ اسے دولت آباد کی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے فوری طور پر جانا پڑا۔

ابھی وہ دولت آباد پہنچنے کے بعد وہاں کے حالات پر توجہ بھی نہ دے پایا تھا کہ پیچھے گجرات میں طغی نامی ایک موچی نے تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ایک شورش برپا کردی اور نہروالہ کھمبائت اور بھڑوچ کو تاخت وتاراج کرڈالا...... سلطان کے آتے ہی طغی بھاگ نکلا اور سلطان پورے تین سال تک اس کے تعاقب میں رہا۔

اس دوران ایک آدھ بار سلطان کا طغی سے سامنا ہوا۔ مقابلے میں شکست کھا کر وہ بھاگ نکلتا اور موقع پا کر پھر فساد برپا کردیتا تھا اور آخرکار وہ سندھ میں پناہ گزین ہوا، جہاں کے جام اور راجپوت حکمرانوں نے اُسے سہارا دیا۔

اس اثنا میں سلطان نے گجرات کے بگڑتے ہوئے حالات کو سدھارنے کی کوشش کی اور کچھ نئے علاقے جن میں ممبئی کے جزائر اور جوناگڑھ شامل تھے، فتح کیے۔

لیکن سلطان کی روانگی کے فوراً بعد جوناگڑھ کے راجہ نے دوبارہ اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔

اسی اثناء میں سلطان کو سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے کرتے گوندل کے مقام پر ایک بیماری کا سامنا کرنا پڑا۔

"بھائی جان! بہتر ہوگا کہ آپ مزید سفر کا ارادہ موقوف کرکے چند دن یہاں قیام فرمائیں تاکہ پوری طرح صحت یابی حاصل ہوسکے۔" ملک فیروز خان نے متفکر لہجے میں التجا کی۔ سلطان کی دن بدن بڑھتی ہوئی کمزوری اور اچانک بیماری نے ملک فیروز کو خاصا پریشان اور ہراساں کردیا تھا۔

"جیسا تم کہتے ہو، ہم عمل کریں گے۔" سلطان کے خشک ہونٹوں پر مبہم سا تبسم بکھرا۔ "کلی طور پر شفایاب ہونے تک ہم یہیں قیام پذیر رہیں گے۔"

"شکریہ بھائی جان۔" ملک فیروز خان کے چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سلطان کے قریب بیٹھ کر اس کے کمزور ہاتھوں کو محبت بھرے انداز میں سہلانے لگا۔

☆......☆......☆

"ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ طغی، ٹھٹھہ کے لئے روانہ ہوا ہے۔" ملک خواجہ جہاں کو یہ خبر ملی تو وہ دوڑا دوڑا سلطان کی خدمت میں حاضر ہوا۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہمیں فوری طور پر ٹھٹھہ کے لئے روانہ ہوجانا چاہئے؟" سلطان نے پُرسوچ نظروں سے ملک فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر ابھی آپ پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئے ہیں۔" شاہی طبیب نے آگے بڑھ کر مؤدبانہ لہجے میں گزارش کی۔ "بہتر ہوگا کہ سفر کو کچھ عرصے کے لئے موقوف کردیا جائے، بصورت دیگر راستے میں طبیعت بگڑ جانے کا خدشہ ہے۔"

"کچھ بھی ہو، سفر ناگزیر ہے۔" سلطان نے نقاہت بھرے مگر دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔

"مگر بھائی جان......" ملک فیروز نے کچھ کہنا چاہا۔

"فیروز...... میرے رفیق، میرے بھائی، تم تو میرے ساتھ ہو نا؟" سلطان نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی درمیان میں بولنا شروع کردیا۔ "اور اگر تم میرے ساتھ ہو...... تو مجھے کچھ نہیں ہوگا...... میں تمہاری محبت اور تمہاری وفا کے سہارے زندہ رہوں گا اور زندگی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہے گا۔"

ملک فیروز خان آبدیدہ ہوکر خاموش ہوگیا اور اسی شام ٹھٹھہ کی طرف سفر شروع کردیا گیا۔

گرد اُڑاتے دشت میں، تپتے سورج تلے ہفتہ بھر سفر جاری رہا اور ابھی منزل پر پہنچنے میں چار روز باقی تھے کہ اچانک پھر سلطان کی طبیعت خراب ہوگئی۔

سفر ملتوی کرکے پڑاؤ ڈال دیا گیا۔

شاہی خیمہ نصب کرکے سلطان کو آرام دہ، نرم بستر پر لٹا دیا گیا۔

"یہ سفوف گرم شیر کے ساتھ نوش فرما لیجئے۔" شاہی حکیم دوا کی پڑیا لئے سلطان سے مخاطب تھا۔

"میرا روزہ ہے۔" سلطان نے اشارے سے جواب دیا۔ محرم کی 10 تاریخ تھی، اس لئے سلطان روزے سے تھا۔

"دوا نہ لی گئی تو بیماری بڑھ جانے کا خدشہ ہے۔" حکیم نے شاہی مولوی رضا خان تاباتی کی طرف تائید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور اسلام میں اس چیز کی رعایت ہے، آپ روزہ ترک کرسکتے ہیں۔"

مولوی کے مشورے پر سلطان کی پیشانی پر ناگواری کی سلوٹیں سمٹ آئی تھیں اور سب کے بے حد اصرار کے باوجود سلطان نے روزہ توڑنے سے انکار کردیا تھا۔

خدا خدا کرکے دن ڈھلا، اذان مغرب ہوئی...... سلطان نے سندھ کی مشہور مچھلی پلا سے روزہ افطار کرکے دوا کھائی۔

اب سلطان کی طبیعت کسی قدر بہتر لگ رہی تھی۔ آرام کی غرض سے سلطان کو خیمے میں تنہا چھوڑ دیا گیا، صرف ملک فیروز خان اس کے پاس تھا۔

سلطان کی پلکوں کو ہلکی سی جنبش ہوئی۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے فیروز کی طرف دیکھا۔

"فیروز......" اس کے لرزتے لبوں سے دھیمی سی آواز برآمد ہوئی۔

"بھائی جان۔" فیروز لپک کر قریب آگیا۔ "اب آپ کیا محسوس کر رہے ہیں؟"

"ٹانگوں میں عجب سی کھنچن ہے۔" سلطان نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔

"میں دبائے دیتا ہوں شاید آپ کو آرام ملے۔" فیروز نے آگے بڑھ کر سلطان کے پاؤں دبانے شروع کردیے۔ غالباً سلطان کو آرام محسوس ہوا، اسی لئے اس کے چہرے پر ایک سکون بھری کیفیت بکھر گئی۔ کافی دیر تک فیروز خان اسی طرح اس کے پاؤں دباتا رہا۔ کافی دیر بعد اس کی آنکھ کھلی۔ فیروز کو اپنے پیر دباتے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"اوہ...... تم اب تک میرے پیر دبا رہے ہو؟"

"آپ کو آرام مل رہا تھا، اس لئے......" فیروز نے محبت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ سلطان کے چہرے پر تشکر بھری مسکراہٹ بکھر گئی۔ "آؤ میرے قریب بیٹھو۔"

سلطان نے ہاتھ کے اشارے سے فیروز کو قریب بلایا...... فیروز، سلطان کے قریب آکر بستر کے کونے پر ٹک گیا...... سلطان نے اپنے سرد اور کمزور ہاتھوں میں اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بہت دنوں سے تم سے...... ایک بات پوچھنا چاہ رہا تھا۔"

"فرمایئے۔" فیروز نے مستعد لہجے میں کہا۔ "میں ہمہ تن گوش ہوں۔"

"پہلے بھی کئی بار...... پوچھنا چاہا...... پر کبھی حجاب مانع آیا تو کبھی پشیمانی آڑے آئی اور کبھی...... مصروفیاتِ حیات نے اس قدر غرق رکھا کہ......" ان چند جملوں کی تسلسل سے ادائیگی نے سلطان کو ہانپنے پر مجبور کردیا۔

"بہتر ہوگا...... آپ اس وقت...... سکوت فرمایئے۔" فیروز نے اس کے سینے کے بڑھتے ہوئے زیروبم کو دیکھتے ہوئے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"باتیں تو بعد میں بھی ہوسکتی ہیں...... مگر...... اس وقت...... اگر اس وقت نہ پوچھا تو پھر زندگی کبھی مہلت نہ دے گی۔" سلطان کے زرد چہرے سے مایوسی ٹپکنے لگی۔ "اور میرے سینے پر ایک بوجھ رہ جائے گا...... فیروز میرے بھائی...... میرے دل سے بوجھ اُتار دو۔"

"حکم کیجئے بھائی جان۔" فیروز ہمہ تن متوجہ ہوتا ہوا بولا۔

"اس دن تم نے...... اس کی باتیں سنی تھیں...... کیا اسے دیکھا بھی تھا؟" سلطان نے ماضی کے کھنڈرات میں گم ہوتے سوال کیا۔ "تمہیں اس حویلی کا...... وہ دالان یاد ہے نا......؟"

"جی۔" پہلے فیروز نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، پھر نگاہیں جھکا کر جواب دیا۔

"بعد میں اس کی خادمہ ایک دوبار میرے پاس آئی تھی...... ایک بار امام ضامن دینے...... اور ایک بار......" فیروز خاموش ہوگیا۔

"بھلا...... کیا نام تھا اس کا؟" سلطان نے سوچتے ہوئے سوال کیا۔

"آپ نے مجھ سے اس کا نام زبان پر نہ لانے کا عہد لیا تھا۔" فیروز نے دھیمی آواز اور معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

"میں تمہیں اس عہد سے آزاد کرتا ہوں۔" سلطان نے فیروز کی طرف دیکھا۔ "غالباً زرنگار نام تھا......؟"

"جی۔" فیروز نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "زرنگار بانو بیگم بنت نصرت خان، آپ سے وہ بے پناہ اور شدید محبت کرتی تھیں اور آپ کی شریکِ حیات بننے کی آرزومند تھیں۔"

"اس کی محبت اور آرزو کو ٹھکرا کر...... کیا میں نے کوئی غلطی کی؟" سلطان نے معصومیت سے سوال کیا۔

"آپ نے تو ہر ہر قدم پر غلطیاں کی ہیں...... مگر شاید آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی یہی تھی...... آپ اُن کی محبت کی قدر نہ کرسکے...... ورنہ شاید آپ کی زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔" یہ سب باتیں فیروز خان سوچ کر رہ گیا تھا، زبان پر لاکر عزیز از جان بھائی کو اذیت پہنچانا نہیں چاہتا تھا، اسی لئے خاموش رہا۔

"ہاں شاید ہم نے غلطی کی۔" سلطان نے پوری سچائی سے اعتراف کیا۔ "پہلے تو نہیں لیکن بعد میں کئی بار ہم نے سوچا کہ...... معلوم کریں کہ وہ...... کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ لیکن ہم ایسا نہ کرسکے...... مگر...... آج...... ہم جاننا چاہتے ہیں...... کیا اس سلسلے میں...... تم ہمیں...... کچھ بتاسکتے ہو؟"

"اگر آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کی خاموشی، بے اعتنائی اور کج ادائی کے بعد ان پر کیا گزری......" فیروز کے لہجے میں غیر محسوس سا درد سمٹ آیا تھا۔ "تو جان لیجئے ان کا نازک دل یہ سب برداشت نہ کرسکا، جب تک آپ کو پالینے کی آس تھی، وہ زندہ رہیں اور جس دن آپ نے تخت دہلی سنبھالا، آپ کو پالینے کی امید دم توڑ گئی اور وہ ٹوٹی امید اور شکستہ دل کے ساتھ...... زندہ نہ رہ سکیں۔"

"کیا......؟" سلطان نے حیران اور بے یقین نظروں سے فیروز کی طرف دیکھا۔

"لیکن دم نکلتے لمحے تک ان کے لبوں پر صرف آپ ہی کا نام تھا...... مرتے دم تک ان کے دل کی دھڑکنیں آپ کا ہی نام الاپ رہی تھیں...... اور ان کی بند ہوتی آنکھیں صرف آپ کی راہ تک رہی تھیں۔"

"اوہ!" سلطان نے اذیت بھرے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

"اور یقیناً وہاں بھی ان کی نظریں آپ ہی کی منتظر ہوں گی۔" فیروز نے جذب کی سی کیفیت میں بتایا اور سلطان نے ذرا سی آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا...... کئی لمحوں کے توقف کے بعد اس کی دھیمی مگر کرب بھری آواز اُبھری۔

"تو اب...... اسے ہمارا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا...... اس سے کہہ دو ہم اس کے پاس آرہے ہیں...... ہم آرہے ہیں۔"

"بھائی جان۔" فیروز نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ "ایسا مت کہئے، آپ کے بغیر آپ کا یہ بھائی کیا کرے گا؟" اس کی آواز میں نمی اُتر آئی تھی۔

"میرا یہ چہیتا بھائی...... حکومت کرے گا...... اپنے بھائی کی غلطیوں کو سدھارے گا...... میں نے تمہیں اپنا ولی عہد نامزد کردیا ہے...... اب یہ تخت وتاج تمہارے حوالے...... خدا تمہاری حفاظت کرے......"

سلطان محمد تغلق کی دھڑکنوں کا انتشار بڑھ گیا تھا، سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ فیروز نے وحشت زدہ انداز میں خیمے کے باہر موجود اطباء کو پکارا مگر ان کے خیمے میں داخل ہونے تک سلطان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔

20/مارچ 1351ء کو جونا خان محمد تغلق کا انتقال ہوا اور اس طرح سلطان کو اپنے عوام سے نجات ملی اور عوام کو اپنے سلطان سے......!

(ختم شد)